برٹرینڈ رسل
کی
بنیادی تحریریں

تالیف و تعارف: ڈاکٹر نعیم احمد

ترجمہ: ریاض احمد
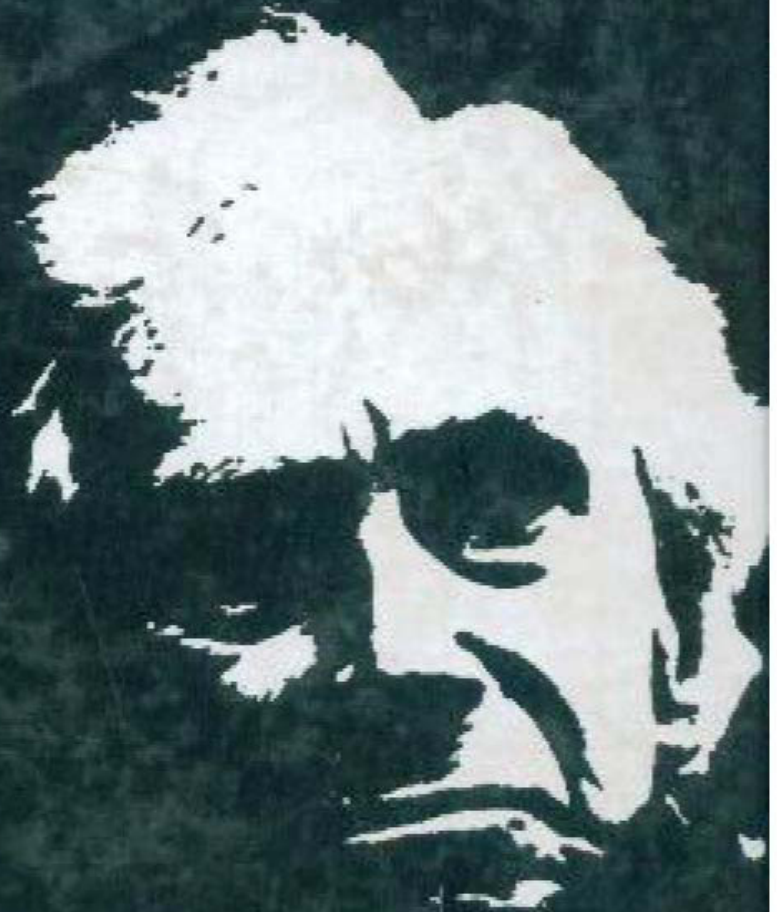
مشعل

رسل کی بنیادی تحریریں

تالیف: ڈاکٹر نعیم احمد

اردو ترجمہ: ریاض احمد

مشعل بکس

آر بی۔۵، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن

لاہور۔54600، پاکستان

رسل کی بنیادی تحریریں

تالیف: ڈاکٹر نعیم احمد
اردو ترجمہ: ریاض احمد

ناشر: مشعل
آر بی 5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور۔54600، پاکستان
فون و فیکس 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

مشعل بکس
آر بی۔۵، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن
لاہور۔54600، پاکستان

تعارف

برٹرینڈ رسل کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ علمی دنیا میں اس کی شہرت قابل رشک ہے۔ کہا گیا ہے کہ کسی اور فلسفی کو اتنی شہرت نصیب نہیں ہوئی اور نہ اتنے قارئین میسر آئے جتنے رسل کے حصے میں آئے۔ اور یہی نہیں کہ اس کا مطالعہ کرنے والے صرف عالم فاضل حضرات یا فلسفے کے طلبہ تھے۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں۔ مثلاً رابرٹ ایگز اور لیسٹر ڈنن نے یہ قصہ بیان کیا ہے کہ ان کے ٹیکسی ڈرائیور نے ان کے ہاتھ میں رسل کی سوانح عمری دیکھتے ہی کہا:

''یہ رسل کی نئی سوانح عمری ہے؟'' (یہ اسی دن کی بات ہے جس دن کتاب شائع ہوئی تھی۔)

''ہاں! ابھی میں نے پڑھی نہیں، اب پڑھوں گا۔''

''میں بھی ضرور پڑھوں گا! کیسا عجیب ہنرور ہے! ہے نا؟''

رسل نے تصنیف و تالیف کے علاوہ بھی نہایت بھرپور زندگی گزاری۔ اس کتاب کے آغاز میں دیئے ہوئے گوشواروں سے اندازہ ہوگا کہ اس کی مصروفیات کا کیا عالم تھا اور اس کے علاوہ اس نے کئی علوم پر اہم تصنیفات بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں اوق فلسفیانہ اور علمی مضامین کے علاوہ ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو روز مرہ کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ فلسفہ، منطق، ریاضیات اور لسانیات کے سلسلے میں اس نے جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں

تبحر علمی اور گہری سوچ کے ساتھ نہایت پیچیدہ علمی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ہلکے پھلکے موضوعات پر بھی عالمانہ لیکن عام فہم انداز میں گفتگو کی ہے۔ اپنی آراء کے متعلق کبھی اس نے ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے اہم مسائل پر اس کا موقف بدلتا رہتا ہے۔ یہ لچک بہت بڑی خوبی ہے۔ لیکن اسی بنا پر رسل کے فلسفہ یا دوسرے مضامین کے متعلق اس کے نقطہ نظر کا احاطہ کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے خاص مضامین فلسفہ اور ریاضیاتی منطق تھے۔ اصول ریاضی میں جو پیش رفت اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے' اسے اس پر خود بھی ناز تھا۔ لیکن اس کی بے لوث غیر جانبداری اور وسیع ظرف دیکھئے کہ اس سلسلے میں ایک خاص نکتہ جسے وہ اپنی ایجاد تصور کرتا تھا' کے متعلق جب اسے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے ایک دوسرا ہم عصر فریجے (Frege) اس کی نشاندہی کر چکا ہے، تو اس امر کے باوصف کہ اس کی زیادہ نشر و اشاعت ابھی نہیں ہوئی تھی، اس نے اس مسئلے پر اولیت اپنے کھاتے میں ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

اس میں شبہ نہیں کہ رسل بیسویں صدی کا سب سے زیادہ بالغ نظر اور ذکی الفہم مفکر تھا۔ اس کی ریاضیاتی منطق' فلسفہ' صحافیانہ سرگرمی اور بالخصوص آزادی افکار، مل اور والٹیر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ تشکیک کے حربے کو جس بے رحمی لیکن کامیابی کے ساتھ اس عہد میں اس نے استعمال کیا ہے، وہ اسی کا حصہ تھا۔ اس نے کارتیزی تشکیک (Cartesion Scepticism) کو کارتیزی انانیت کے رد میں جس طرح استعمال کیا ہے وہ اس کی ذہانت و فطانت اور جرأت افکار کا ایک نمونہ ہے۔

ایک رائے اس کے متعلق یہ بھی تھی کہ وہ اکثر مواقع پر غلطی پر ہونے کے باوصف علمی مباحث میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیتا۔ لیکن علمی متانت' شائستگی اور انصاف پسندی کا یہاں بھی بھرپور مظاہرہ کرتا۔

خود اپنے متعلق اس نے ہمیشہ ایک نوع کی انکساری سے کام لیا ہے۔ صاف گوئی کا دامن وہ کہیں بھی نہیں چھوڑتا۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ آج مجھے اپنی کئی تحریریں کسی اور کی لکھی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ کیونکہ میں نے اپنے بہت سی آراء وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل کر لی ہیں' لیکن وہ یہ بات یوں کہتا ہے جیسے کسی دوسرے کے متعلق کہہ رہا ہو۔ کہیں اعتذار یا اپنی تبدیلی رائے کے لئے جواز مہیا کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ تبدیلی رائے اس کے لئے ایک

خاص اہمیت رکھتی ہے جس کی وضاحت اس نے یوں کی ہے کہ بعض لوگ جو فلسفے میں موقف کی تبدیلی کو روا نہیں رکھتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفے کو اکثر و بیشتر سائنس کی بجائے الہیات سے منسلک کیا گیا ہے۔ اس طرح فلسفہ الہیات کا تابع مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک طرح کی ذہنی مجبوری بن جاتا ہے۔ فلسفے میں کسی نظام کو غیر مبدل نہیں سمجھنا چاہئے' ایک منصف مزاج شخص جو سائنسی ذہنیت کا حامل ہو' اپنے معتقدات کو حتماً صحیح قرار نہیں دے سکتا۔ تاہم اسے یہ اعتماد بھی حاصل ہوتا ہے کہ اس کے اکثر معتقدات یکسر غلط نہیں تھے۔ ترقی پذیر فلسفے کے تصور کو اس نے ایک تشبیہ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دور سے دھند میں لپٹے ہوئے پہاڑ کی حدوں کا تعین ممکن نہیں ہوتا۔ پھر جب دھند کچھ کچھ چھٹتی ہے تو ان کی ہیئت واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ الجھاؤ پھر بھی باقی رہتا ہے اور یہ دھندلکا بھی بذاتہ کسی حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اس نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ کچھ لوگ وضاحت کو اسی وجہ سے رد کر دیتے ہیں کہ اس کا حصول مشکل اور کمیاب ہے۔ شاید وہ فلسفے کے بلند سنگھاسن سے نیچے قدم رکھنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ بھاری بھرکم اسلوب انہیں باعزت اور پروقار لگتا ہے۔ تاہم رسل وضاحت اور سلاست سے گریز کا قائل نہیں ہو سکا۔ اس کا اپنا قول ہے: ''میں قطعیت کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے روشن روشن خدوخال اچھے لگتے ہیں مجھے دھندلے ابہام سے نفرت ہے۔'' علم میں اسی قطعیت کی تلاش میں وہ اپنے بچپن ہی میں جیومیٹری سے اس وقت بدگمان ہو گیا تھا جب اس کے بھائی نے اسے بتایا تھا کہ

''اقلیدسی قضیئے ناقابل ثبوت ہیں۔''

اصول ریاضی اور منطق پر رسل نے خصوصی توجہ صرف کی۔ چنانچہ Principia Mathematica جسے اس نے وائٹ ہیڈ کے ساتھ مل کر دس سال میں مکمل کیا' ایک عہد ساز تصنیف ہے۔ اس نے منطق' ریاضیاتی فلسفے' لسانیاتSemantics میں جو انقلابی اور فکر انگیز اضافے کئے' انہیں بجا طور پر اس کا معرکہ آراء کارنامہ قرار دیا جاتا ہے تاہم یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اصول ریاضی کا مطالعہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ کیونکہ یہ ادق معانی پر مشتمل ہے۔ اور خصوصاً اس کے آخری حصے تو بہت کم سمجھے گئے ہیں۔ اپنی دوسری تصانیف میں بھی ریاضیات کو منطقی سانچے میں ڈھالنا اور روائتی منطق کا سخت گیر محاکمہ ہمیشہ

رسل کے پیش نظر رہا ہے۔ اس کا ایک ذیلی موضوع فلسفہ لسانیات ہے۔ جس پر رسل نے بہت گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ معانی کی تعبیر کے متعلق اس کے نظریات کو ایک بلند تر مقام حاصل ہے۔ اسی طرح علمیات کے میدان میں بھی اس نے گہری سائنسی بصیرت سے کام لیا ہے۔ اور جامد نظریات سے چمٹے رہنے کے مقابلے میں اس نے ایک فکر انگیز حرکی سعی وتفحص کا مظاہرہ کیا ہے۔

مابعد الطبیعیات میں باقی سب کچھ نظر انداز کر کے' اگر رسل کے نظریہ ایٹمیت ہی کوئی پیش نظر رکھا جائے تو اس کی اہمیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ فلسفے پر اس کی نظر بہت گہری اور وسیع تھی۔ اسے مختلف نظام ہائے فلسفہ پر عبور ہی حاصل نہیں بلکہ ان کے تقابلی مطالعہ اور باہمی چپقلش سے دلچسپ اور نتیجہ خیز نکات اخذ کرنے میں اس نے ایک عجیب وغریب صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے جس کے طفیل تاریخ فلسفہ کا مطالعہ اپنی پیچ در پیچ تاریخ معنویت اور میکانکی یبوست کے ماحول سے نکل کر کھلی کھلی فضا میں ایک نئی دلکشی کے ساتھ جلوہ پیرا ہوتا ہے۔

نفسیات میں رسل کا جھکاؤ عضویاتی نفسیات یا کرداری نفسیات کے حق میں نظر آتا ہے۔ وہ ذہن اور مادے کی دوئی کے پرانے نظریئے کا قائل نہیں۔ وہ ذہن اور مادے کو واقعات کے تسلسل کے طور پر دیکھتا ہے اور ان میں ایک ترکیبی وحدت کا حامی ہے۔

اخلاقیات وہ خاص موضوع ہے جس پر رسل کو زبردست نقد و جرح کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس نے جس جرأت اظہار کا مظاہرہ کیا ہے وہ کسی ہم عصر مفکر کو نصیب نہیں ہوئی۔ تاریخ رد وقبول کے معاملے میں اس کے نظریات کے متعلق کیا فیصلہ کرتی ہے اس سے قطع نظر اہم بات یہ ہے کہ اس نے غیر مقبول آراء کو پیش کرنے اور غیر معقول رویوں کو رد کرنے میں' جس بالغ نظری سے کام لیا ہے' وہ بہرصورت قابل داد ہیں۔ روایتی بندھے ٹکے اخلاقی اصول و قوانین جن کی جڑیں قدیم توہمات میں پیوست ہیں، آج بھی اکثر لوگوں کو بہت عزیز ہیں۔ ان کے لئے رسل کی اخلاقیات میں دلچسپی کے مواقع کم ہی نظر آئیں گے۔ جنس کے متعلق رسل کے نظریات میں بھی یہی بات ہے کہ وہ توہمات کا زبردست نقاد ہے۔ ان خیالات کی بنا پر اسے عملی زندگی میں نقصانات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنس کو اس کے نظام اخلاق میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں۔ سائنسی انسان دوستی کو اس کے نزدیک انسانی

اخلاق و کردار میں بنیادی اہمیت دی جانی چاہئے۔ سماجی اور انفرادی رویوں کا یہی بہترین حل ہے۔ نظام اخلاق کے متعلق اس کے نظریات میں بھی مسلسل ارتقائی تغیر و تبدل نظر آتا ہے۔ جو اس جمود کی ضد ہے جس کو رسل نے کبھی قبول نہیں کیا۔

نظریہ تعلیم کے سلسلے میں رسل نے جو کچھ کیا ہے' اس کی حیثیت اس کے نظریات فلسفۂ منطق' ریاضی وغیرہ کے مقابلے میں دب کر رہ گئی ہے۔ تاہم اخبار والوں کو اس کے ہاں کچھ سنسنی خیز مواد ہاتھ آ گیا اور حسب معمول انہوں نے اسے خوب اچھالا۔ خوب افسانہ طرازیاں ہوئیں۔ ایک قصہ آپ بھی سن لیجئے۔ اس کا تعلق بیکن ہل سکول سے ہے۔ ''دروازے پر دستک ہوئی تو ایک نوعمر لڑکی کوئی لباس پہنے بغیر دروازہ کھولنے چلی آئی۔ اس کو دیکھ کر آنے والے کے منہ سے بے اختیار نکلا ''اوہ میرے خدا'' اور لڑکی نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ ''یہاں کوئی خدا نہیں ہے۔'' دراصل یہ کہنا بھی شاید درست ہے کہ تعلیمی مسائل کی طرف اس کی توجہ محض ایک اتفاقی اور نجی نوعیت کی حامل تھی۔ یعنی اپنے بچوں کی تعلیم کا مسئلہ' اگرچہ دل ڈیوراں نے اپنی بچی کی تعلیم کے سلسلے میں جس انہماک اور عملی تعاون کا ذکر کیا ہے' وہ رسل کے ہاں مفقود ہے۔ تاہم استاد کی ذمہ داری اور اس پر آشوب دور میں ایک معقول نظام تعلیم کی اہمیت پر اس نے بالخصوص اور بجا طور پر بے حد اصرار کیا ہے۔

سیاسیات میں رسل کی دلچسپی آغاز زندگی ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ یہ ایک طرح سے اس کا ورثہ بھی تھا۔ سیاسی نظریات میں اس کی بے باکی کا عام تذکرہ رہا ہے۔ تاہم عملی سیاست میں ان نظریات کے اطلاق میں اس نے تجزیاتی طریق کار کو اپنائے رکھا۔ سیاست میں اس کی دلچسپی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ نوبیل انعام قبول کرتے ہوئے اس نے جو تقریر کی تھی اس کا عنوان تھا ''سیاسی اعتبار سے اہم ترجیحات'' سیاسی معاملات میں اسے ایک خاص پیش بینی کی مہارت حاصل تھی۔ اس کی پہلی کتاب ''جرمن سوشل جمہوریت'' 1896ء میں شائع ہوئی تھی۔ حسب معمول اس کا موقف وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس نے کم وبیش پچاس سال قبل ان رجحانات کا صحیح طور پر اندازہ لگا لیا تھا جو بعد میں جرمنی میں آمریت اور جنگجوئی کی صورت میں نمو پذیر ہوئے۔ اپنے موقف کی تبدیلی کے بارے میں رسل کا ادعا یہ تھا کہ موجود حقائق و واقعات کے بے لوث تجزیئے سے صداقت کا صرف قرب ہی نصیب ہو سکتا ہے' قطعیت کی تمنا عبث ہے۔

''قوت'' کا مسئلہ اس کے لئے اس سلسلے میں خاص اہمیت کا حامل رہا۔ چنانچہ اس نے کمال وقت نظر کے ساتھ فاشزم اور کمیونزم کے نظریات کی بنیادی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ یوں بھی وہ مارکس کی اقتصادیات کا قائل نہیں تھا۔ اگر چہ علم اقتصادیات پر اس نے خاص توجہ مبذول نہیں کی تاہم اس نے مارکس کے ''فاضل قدر'' کے نظریئے اور دوسرے امور پر کڑی تنقید کی ہے۔ اس کے نزدیک صرف طبقاتی کشمکش ہی تاریخی مناقشات کی وجہ نہیں۔ دوسرے نفسیاتی عوامل بھی اس میں اتنے ہی اہم ہوتے ہیں۔

تاریخ میں رسل پیشہ ور تاریخ دان ہونے کے دعوے سے دستبردار ہونے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔ تاہم یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تاریخ میں اس کی دلچسپی اوائل شباب سے لے کر آخری عمر تک قائم رہی۔ فلسفے کی تاریخ مرتب کرنے کا محرک بھی یہی دلچسپی تھی۔ رسل کا خیال ہے کہ تاریخ کا مطالعہ صرف علماء تاریخ ہی کے لئے مخصوص نہیں' اسے تو ہر صاحب شعور کا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہئے۔ انفرادی زندگی میدان تگ و تاز میں کوتاہ نظری پیدا کرتی ہے۔ یہ صرف تاریخی شعور ہے جو انسان کو زندگی میں تواتر سے پیش آنے والی غلطیوں سے آگاہی بخشتا ہے اور اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ زمانہ حال میں ثابت قدمی کے ساتھ حماقتوں کا مقابلہ کر سکے۔

رسل نے ابتداء سے لاادریت کے مسلک کو قبول کر لیا تھا۔ اس کی دو اتفاقی وجوہ کا اس نے خود ذکر کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ ''غایت اولیٰ'' والے نظریئے کو مل کی خودنوشت سوانح حیات میں وارد ہونے والے ایک سوال نے کہ ''پھر خدا کو کس نے پیدا کیا'' ہمیشہ کے لئے متزلزل کر دیا۔ اسی طرح جب اس کے بڑے بھائی نے اسے یہ بتایا کہ اقلیدسی قضئے ناقابل ثبوت ہیں' تو اس نے ظن وتخمین کی شاہراہ چلنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نزدیک اہمیت ان مسائل کو حاصل ہے جو لاینحل ہیں۔ ذہانت و فطانت، جوابات دریافت کرنے کا نام نہیں، یہ تو صرف سوال کرنے کی اہلیت ہے۔

رسل نے مذہب کے سلسلے میں جس جرأت اظہار کا مظاہرہ کیا ہے وہ دریدہ دہنی تو نہیں لیکن مذہب کے اجارہ داروں کے نزدیک گستاخی پر محمول تھی اور بہت حد تک پریشان کن۔ بیسویں صدی میں فلسفیوں نے بالعموم مذہبی امور سے بحث مباحثہ بہتر نہیں سمجھا۔ اس بات کا فیصلہ تو آئندہ زمانہ ہی کرے گا کہ رسل نے ان مباحث کو چھیڑ کر غلطی کی ہے یا اس کی آرا

کہاں تک قرین صحت تھیں، تاہم رسل کی صاف گوئی، بے باکی اور جرأت کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس کتاب میں برٹرینڈ رسل کے چند ایسے مضامین کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے عام دلچسپی کے حامل ہیں۔ دقیق فلسفیانہ مضامین کو سردست کسی اور موقعہ کے لئے اٹھا رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے صرف فلسفہ کے سنجیدہ طالبعلم ہی استفادہ کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اصل تصنیفات زیادہ سودمند ثابت ہوتی ہیں۔

ادارہ مشعل گزشتہ کئی برس سے ادب اور سائنس کے علاوہ جدید فلسفیوں پر بھی کتابیں شائع کر رہا ہے۔ اس ضمن میں رسل پر بھی کچھ کتابیں اردو زبان میں شائع کی گئی تھیں۔ جنہیں طلبہ اور عام قارئین نے از حد پسند کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بھی پسند کی جائے گی اور فلسفہ و ادب کے طلبہ اس سے خصوصی طور پر مستفید ہوں گے۔ میں جناب ریاض احمد کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے پیرانہ سالی اور خرابی صحت کے باوجود ہمارے لئے ترجمہ کا کٹھن کام سرانجام دیا۔ ان کی اس علمی خدمت کے لئے میں انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ریاض احمد کے نام سے نئی نسل کے لوگ شاید زیادہ واقف نہ ہوں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک وہ دور بھی تھا جبکہ ان کا نام حلقہ ارباب ذوق کے علاوہ دیگر ادبی محفلوں اور جرائد و رسائل کے لئے ایک معتبر اور مستند حوالہ تھا۔ سجاد باقر رضوی کے بقول ریاض احمد ''اردو تنقید کا ایک معتبر نام ہے جس کے ادبی فیصلوں اور محاکموں پر اعتماد کرنا ادبی ذوق کی علامت ہے۔'' ''میرا جی'' کے بعد ریاض احمد کو ادبی تنقید کے نفسیاتی دبستان کا اہم نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ریاض احمد صرف نقاد ہی نہیں بلکہ ایک صاحب طرز انشا پرداز اور منفرد شاعر بھی ہیں۔ انور سدید انہیں آل احمد سرور، سیّد احتشام حسین، خورشید الاسلام اور سہیل بخاری کی طرح نقاد شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم رانا مرحوم کی روح کو اللہ تعالیٰ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، انہوں نے نہایت محنت اور لگن سے ریاض احمد کے بکھرے ہوئے مضامین اور غزلوں نظموں کو یکجا کر کے متعدد مجموعوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ ''دہان زخم'' ریاض احمد کا شعری مجموعہ ہے۔ ''تنقیدی مسائل''، ''ریاضتیں''، ''دریاب'' اور چند سال پہلے شائع ہونے والی کتاب ''تصدیق'' ریاض احمد کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں جن میں نفسیاتی

اور جمالیاتی تنقید کا ایک دل آویز امتزاج ملتا ہے اور ایک مخصوص عہد کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب سے ریاض احمد کی شخصیت کی ایک اور جہت سامنے آتی ہے یعنی وہ صرف نقاد، شاعر اور انشا پرداز ہی نہیں بلکہ ایک اچھے مترجم بھی ہیں۔

ادارہ مشعل کے ایڈیٹر جناب مسعود اشعر صاحب نے جس لگن اور مستعدی سے اس کتاب کی تکمیل کے لئے محنت کی ہے اس کے لئے میں ان کا بھی بہت شکر گزار ہوں۔ آخر میں قارئین سے التماس ہے کہ وہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنی قیمتی آراء اور مشوروں سے ہمیں نوازیں تا کہ ہم آئندہ کتابوں کو مزید بہتر بنا سکیں۔

ڈاکٹر نعیم احمد

صدر شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب نیو کیمپس لاہور

26 اگست 1997ء

معروضات

(مترجم)

جو شخص فلسفے کا باقاعدہ طالبعلم بھی نہ رہا ہو' اس کے لئے برٹرینڈ رسل کے مضامین کا ترجمہ حوصلہ شکن تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی ایک اعزاز بھی ہے۔ میں ڈاکٹر نعیم احمد اور ادارہ مشعل پاکستان کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس کام کا اہل سمجھا۔ البتہ یہ سوچ کر میں پریشان ہو جاتا ہوں کہ رسل کے خیالات کو سمجھنے اور انہیں اردو زبان میں منتقل کرتے ہوئے خدا جانے مجھ سے کتنی مضحکہ خیز غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ یہ اطمینان ضرور ہے کہ ادارہ کے فاضل مدیر ان کی اصلاح کر کے میری لاج رکھ لیں گے۔ چنانچہ جناب مسعود اشعر کا شکریہ مجھ پر لازم آتا ہے۔

رسل بظاہر بے تکان لکھے چلے جانے والا مصنف نظر آتا ہے، دنیا کا کون سا علم ہے جس پر اس کو فاضلانہ دسترس حاصل نہیں۔ البتہ فلسفہ' منطق' اصول ریاضیات اس کے خاص موضوعات ہیں۔ سائنس' نظریاتی طبیعیات' لسانیات' علمیات' نفسیات' اخلاقیات' تعلیم' سیاسیات' اقتصادیات، تاریخ' مذہب' ہم عصر بین الاقوامی معاملات' غرض علم کے ہر شعبے میں اس کی عطاContribution کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس نے اکثر علوم کو نئی فکری نہج بہم پہنچائی ہے۔ اس کی تحریروں میں اس کے عہد کی تمام تر علمی سرگرمیاں اور خارجی کشمکش منعکس ہوئی ہے اور اس نے یہ کشمکش کنارے پر کھڑے ہو کر نہیں دیکھی۔ بلکہ وہ موجوں کی جولانیوں کے ساتھ شامل تھا۔ اس کے ہم عصر فلسفیوں نے اس کی اس صلاحیت کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا تھا:

''اپنے موقف میں رسل اگر غلطی پر ہوتا پھر بھی وہ طوفانی اور نہ ختم ہونے والے مناقشات میں ایک سیاسی باغی کے جوش و جذبہ کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ تاہم اس نے اپنے رویئے میں شائستگی اور منصف مزاجی کی ان روایات کو زندہ رکھا ہے جو پری کلیز کے عہد سے لے کر آج تک مغربی تہذیب کا امتیاز رہی ہیں۔''

(ایڈرین کوچ Philosophy for a Time of Crisis)

اس نے بے شک بہت لکھا ہے، لیکن ہر طبقے کے قارئین کی جتنی بڑی تعداد نے اسے داد تحسین پیش کی ہے وہ اور کسی فلسفی کے حصے میں نہیں آئی۔ اس میں صرف اہلِ علم ہی شامل نہیں، عام ٹیکسی ڈرائیور تک سبھی شامل ہیں۔

مختلف شعبہ ہائے علم میں اس کی آراء اکثر بدلتی رہی ہیں۔ وہ اس پر کبھی خجل نہیں ہوا کہ یہ اس کی سوچ کا ارتقائی عمل تھا۔ اور اس حریت فکر کا ایک مظہر جس کی اس نے خود تمام عمر آبیاری کی۔ جن اہلیتوں کی بنا پر اسے نوبیل انعام کا حق دار گردانا گیا، ان میں یہ حریت فکر سرفہرست تھی۔ البتہ وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جب1910ء میں اس نے برطانوی پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لینا چاہا تو انتخابی کمیٹی نے اسی بناء پر اسے نااہل قرار دیا۔ (اس سے پہلے1907ء میں بھی وہ انتخابی مہم میں شکست سے دوچار ہوا تھا) اسی طرح 1916ء میں اسے ایک پمفلٹ کی بنا پر100 پونڈ جرمانہ کیا گیا۔ اور جرمانے کی وصولی کے لئے اس کی لائبریری نیلا کر دی گئی۔(ا)

بہرحال مترجم کا یہ مقام نہیں کہ وہ رسل کے مقام و مرتبے سے بحث کرے۔

برٹرینڈ رسل نے اپنے ایک مضمون میں جو ان تراجم میں شامل ہے، اپنے اسلوب تحریر اور لکھنے لکھانے کے طریق کار کی بڑی دلچسپ وضاحت پیش کی ہے، کہ وہ ہر بات کو مختصر ترین الفاظ میں اور پوری وضاحت کے ساتھ لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ باز نوشت سے بھی جی نہیں چراتا (اگرچہ اسے اصرار ہے کہ اس کا اولین مسودہ ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔) اور ادبی خوبیوں کو بھی نظرانداز کر جاتا ہے۔ تاہم اس کے اسلوب نگارش میں ایک خلاقانہ بہاؤ ہے، الفاظ اس کے قلم سے موجوں کی جولانی کی طرح یوں لپک کر نکلتے ہیں کہ ان کی رفتار کے ساتھ قدم ملانا مشکل ہو جاتا ہے۔ قاری کا سانس پھول

پھول جاتا ہے۔ جوش بیان میں وہ بعض اوقات اپنے موقف کے برعکس، ایک فقرے کو کئی سطروں پر پھیلا دیتا ہے۔صرف ایک مثال پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا:

In these moments of insight, we lose our eagerness of temporary desire, all struggling and striving for petty ends, all care for the little trivial things that, to a superficial view, make up the common life of day by day; we see, surrounding the narrow raft illumined by the flickering light of human comradeship, the dark ocean on whose rolling waves we toss for a brief hour; from the great night without, a chill blast breaks in upon our refuge; all the loneliness of humanity amid hostile forces is concentrated upon the individual soul, which must struggle alone, with what of courage it can command, against the whole weight of a universe that cares nothing for its hopes and fears.

ایسے موقعوں پر مترجم کی بوکھلاہٹ شاید قابل معافی ہو۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ رسل ''کاتا اور لے دوڑی'' کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اپنے قول کے مطابق وہ ایک چیز کو بار بار لکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ دراصل وہ اپنے موضوع پر پہروں نہیں بلکہ مہینوں غور کرتا ہے۔

تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت

وہ سوچتا رہتا ہے، لاوا اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے اور پھر ایک دن سارے بند توڑ کر بہہ نکلتا ہے۔اس نے خود ''لاول لیکچرز'' کے سلسلے میں بیان کیا ہے وہ کم وبیش ایک سال سوچتا رہا اور پھر جھلا کر1913ء کے آخری دن ایک سٹینوگرافر کا انتظام کیا اور پھر یوں ہوا:

I suddenly saw exactly what I had to say and proceeded to dictate the whole book without a moment's hesitation.

اس کتاب کے شروع میں رسل کی کتابوں کی ایک فہرست (انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں) شامل کر دی گئی ہے۔ انگریزی فہرست کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ اس کے بغیر اصل تصنیف تک پہنچنا مشکل ہوتا۔ اس فہرست سے اندازہ ہوگا کہ اس نے کتنے متنوع مضامین پر خامہ فرسائی کی ہے اور اس کی تصانیف کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کے مطالعے کے لئے ایک عمر چاہئے۔ ایک دوسری فہرست میں اس کی علمی اور عملی جدوجہد کے

اہم واقعات کا ایک گوشوارہ تاریخی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہو گا کہ رسل نے نہایت مصروف اور باثمر زندگی بسر کی۔

کہا جاتا ہے کہ فلسفی بالعموم عزلت نشین ہوتے ہیں۔ مثلاً کانت کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے آبائی قصبے سے چالیس میل سے زیادہ دور عمر بھر نہیں گیا۔ لیکن رسل نے چار براعظموں میں تعلیمی فرائض ادا کئے۔ اور مختلف موضوعات پر لیکچر دیئے۔ امریکہ تو وہ اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ چین' جاپان' روس اور نیوزی لینڈ میں بھی اس نے تدریسی فرائض سرانجام دیئے۔ اپنے قیام کے دوران اس نے ان ملکوں کے سماجی، تہذیبی اور سیاسی حالات کا بغور جائزہ لیا اور اپنے خیالات کو عالمانہ سطح پر منضبط کیا۔

کمپوزنگ کے مراحل کو فراز کمپوزنگ سنٹر والوں کی فنی مہارت اور تعاون نے آسان بنا دیا' اس کے لیے مترجم ان کا شکر گزار ہے۔

حواشی

ا۔ انگریزوں نے متحدہ ہندوستان میں بطل حریت مولانا حسرت موہانی کی لائبریری ضبط کر لی تھی۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ رسل کے دوستوں نے اس کی لائبریری جرمانہ ادا کر کے محفوظ کر لی اور مولانا کی نایاب کتابیں تھانے کے فرش پر دیمک چاٹ گئی۔ یا سپاہیوں کے چولہوں کی نذر ہو گئیں۔

☆☆☆

CHRONOLOGY OF THE LIFE OF BERTRAND RUSSELL

1872 MAY 18, Born at Ravenscroft near Trelleck, Monmouthshire, England.

1974 Death of Lady Amberley, mother of Bertrand Russell.

1876 JANUARY. Death of Lord Amberley, father of Bertrand Russell, followed by litigation over the will of his father. The designation of freethinkers as guardians disaffirmed. His grandmother, Lady Russell and Rollo Russel designated as his guardians. At Pembroke Lodge.

1883 First lessons in Euclid from his brother, Frank. Studied under private tutors.

1883 Began his philosophical speculations, particularly on religious problems. Penned his thoughts surreptitiously in a journal.

1890 Entered Trinity College, Cambridge.

1894 Took Moral Science Tripos. Fellowship dissertation on The Foundations of Geometry. Honorary British Attache in Paris. Marriage to Alys Smith.

1895 Visit to Germany. Study at the University of Berlin. Lectured to the London School of Economics and Political Science on German Social Democracy. Elected Fellow of Trinity College.

1896 Visit to America with Alys Russell. Lectured at Johns Hopkins and Bryn Mawr.

1898 Lectured at Cambridge on Leibniz. With G.E. Moore in rebellion against Kant and Hegel.

1900 Attended the International Congress of Philosophy in Paris.

1905 First success with the Theory of Descriptions.

1907 Stood unsuccessfully for Parliament.

1908 Made a Fellow of the Royal Society.

1910 Entire decade devoted to collaboration with A.N. Whitehead on *Principia Mathematica*. First volume published this year. Failed of nomination for Parliament by the Liberal Party because of agnostic views. Lecturer in Mathematical Logic at Trinity College, Cambridge.

1911 President of The Aristotelian Society. Separation from Alys Russell.

1913 Lecture at Ecole des Hautes Sociales on The Philosophical Importance of Mathematical Logic. Addressed the Heretics at Trinity College on The Philosophy of Bergson.

1914 Gave the Herbert Spencer Lecture in Philosophy at Oxford on Scientific Method in Philosophy. Lectured on Our Knowledge of the External World as Lowell Lecturer in Boston. Public speaker and pamphleteer against World War I.

1915 Address to the Philosophical Society of Manchester on The Ultimate Constituents of Matter.

1916 Fined Pound 100 in the Everett Case because of a pamphlet criticizing a two-year sentence of a conscientious objector. His library sold when the fine was not paid. Bought by his friends. Loss of his lectureship at Trinity College.

1918 Gave a course of eight lectures in London describing his Logical Atomism in which he acknowledges the influence of Wittgenstein over the past four years. Sentenced to six months in Brixton Prison because of an article in which he quoted the report of a Congressional investigation into the use of American troops against strikers. Second Division sentence changed to First Division. Wrote *Introduction to Mathematical Philosophy* while in prison.

1920 Visit to Russia.

1921 Divorce from Alys Russell. Marriage to Dora Black. Visit to China and Japan. Lectured on The Analysis of Mind in London and Pekin. Birth of John, Lord Amberley.

1922	Labour Candidate for Parliament. Gave the Moncure D. Conway Memorial Lecture on Free Thought and Official Propaganda.
1923	Labour Candidate for Parliament. Birth of Kate.
1924	Lecture tour in the United States. Debate with Scott Nearing before the League for Public Discussion on Bolshevism and the West. Lecture to the Free Youth at Cooper Union, New York, on How to be Free and Happy.
1925	Tarner Lectures at Trinity College on The Analysis of Matter.
1927	Lecture tour in the United States. Started a school at Beacon Hill near Petersfield. Became headmaster with Dora Russell as headmistress. Lecture at Battersea Town Hall before the South London Branch of the National Secular Society on Why I am not a Christian.
1929	Lecture tour in the United States. Talk to the Contemporary Thought Class at Northwestern University, Evanston, Illinois, on Three Ways to the World.
1930	Debate with John Cowper Powys in New York on Is Modern Marriage a Failure?
1931	Lecture tour in the United States. Debate with Sherwood Anderson on Shall the Home be Abolished? Became Third Earl Russell on the death of his brother, Frank.
1935	Divorce from Dora Russell. Withdraws from the school.
1936	Gave the Earl Grey Memorial Lecture at Armstrong College, Newcastle upon Tyne, on Determinism and Physics. Marriage to Helen Patricia Spence.
1937	Birth of Conrad.

1938 Lectures at Oxford on Language and Fact. To the United States where he remained until 1944. Radio Discussion with T.V. Smith and Paul Douglas on Taming Economic Power. Visiting Professor at The Univeristy of Chicago until 1939.

1939 Radio Discussion on University of Chicago Round Table on Is Security Increasing? Addred the Sociology Club of the University of Chicago on The Role of the Intellectual in the Modern World. Lectures at The University of California in Los Angeles until 1940.

1940 The William James Lectures at Harvard on An Inquiry into Meaning and Truth. The Bertrand Russell Case involving the loss of his appointment to the College of the City of New York.

1941 Lecture at The Barnes Foundation in Merion, Pennsylvania, on The History of Philosophy. Spoke over CBS on the Invitation to Learning programme with Huntington Cairns, Allan Tate and Mark Van Doren on Hegel's Philosophy of History. Radio talk over Station WEAF with Rex Stout, entitled Speaking of Liberty.

1942 Spoke over CBS on the Invitation to Learning programme with Jacques Barzun on Descartes's *Discourse on Method* and with Scott Buchanan and Mark Van Doren on Spinoza's Ethics. Later with Katherine Ann Porter on Carroll's *Alice in Wonderland*. Spoke on The American Forum of the Air on What About India?

1943 Termination of the Barnes contract. Successful suit for breach of five-year contract.

1944 Sepeaks at the Rand School, New York, over Station WEVD on Co-operate with Russia. Returns to England. Elected to Fellowship at Trinity College, Cambridge, for a second time. The topic of his annual course: Non-Demonstrative Inference.

1947 Addressed the National Book League at Friends House on Philosophy and Politics.

1948 Accident on flight to Norway en route to Trondheim where he was to lecture on The Prevention of War. Saved himself by swimming in a heavy overcoat for ten minutes. Gave the first Reith Lectures over BBC on Authority and the Individual.

1949 Awarded the Order of Merit. Addressed the Westminister School on Atomic Energy and the Problems of Europe.

1950 Awarded the Nobel Prize for Literature in recognition of his many sided and important work in which he has constantly stood forth as a champion of humanity and freedom of thought'. Visit to Australia.

1951 Gave the Matchette Foundation Lectures at Columbia University in New York on The Impact of Science on Society. Contributed to the BBC Third Programme talks on the Political and Cultural Influence (of America), The Nature and Origin of Scientific Method and Scepticism and Tolerance. Death of Alys Russell.

1952 Divorce from Patricia Russell. Marriage to Edith Finch.

1955 Awarded the Silver Pears Trophy for work on behalf of World Peace.

CHRONOLOGICAL LIST OF RUSSELL'S PRINCIPAL WORKS

1896 German Social Democracy. (A chapter by Alys Russell.)

1897 An Essay on the Foundations of Geometry.

1900 A Critical Exposition of the Philosophy of Leibniz.

1903 The Principles of Mathematics.

1910 Principia Mathematica__ Vol. I. (with A.N. Whitehead.)

1910 Philosophical Essays.

1912 Principia Mathematica__ Vol.II. (With A.N. Whitehead.)

1912 The Problems of Philosophy.

1913 Principia Mathematica__ Vol.III. (with A.N. Whitehead.)

1914 Our Knowledge of the External World as a Field for Scientific Method in Philosophy.

1914 Scientific Method in Philosophy.

1914 The Philosophy of Bergson. (Controversy with H.W. Carr.)

1915 War, the Offspring of Fear.

1916 Principles of Social Reconstruction. (Why Men Fight: A Method of Abolishing the International Duel.)

1916 Policy of the Entente, 1914. (Part of: Justice in War-Time.)

1916 Justice in War-Time.

1917 Political Ideals.

1918 Mysticism and Logic and Other Essays.

1918 Raods to Freedom: Socialism, Anarchism and Syndicalism. (Proposed Roads to Freedom: Socialism, Anarchism and

1919 An Introduction to Mathematical Philosophy.

1920 The Practice and Theory of Bolshevism. (Bolshevism in Theory and Practice.)

1921 The Analysis of Mind.

1922 The Problem of China.

1922 Free Thought and Official Propaganda.

1923 The Prospects of Industrial Civilization. (with Dora russell.)

1923 The ABC of Atoms.

1924 Bolshevism and the West. (Debate with Scott Nearing.)

1924 Icarus or the Future of Science.

1924 How to be Free and Happy.

1924 Logical Atomism.

1925 The ABC of Relativity.

1925 What I Believe.

1926 On Education Especially in Early Childhood. (educationa nd the Good Life.)

1927 Why I am not a Christian.

1927 Why I am not a Christian.

1927 The Analysis of Matter.

1927 An Outline of Philosophy. (Philosophy.)

1928 Sceptical Essays.

1929 Marriage and Morals.

1930 The Conquest of Happiness.

1930 Has Religion Made Useful Contributions to Civilization?

1931 The Scientific Outlook.

1932 Education and the Social Order (Education and the Modern Wrold.)

1934 Freedom and Organization 1814-1914. (Freedom versus Organization 1814-1914.)

1935 In Praise of Idleness and Other Essays.

1935 Religion and Science.

1936 Which Way to Peace?

1936 Determinism and Physics.

1937 The Amberley Papers. The Letters and Diaries of Bertrand Russell's Parents. (Wtih Patricia Russell.)

1938 Power: A New Social Analysis.

1940 An Inquiry into Meaning and Truth.

1945 A History of Western Philosophy.

1948 Human Knowledge: Its Scope and Limits.

1949 Authority and the Individual.

1950 Unpopular Essays.

1951 The Impact of Science on Society.

1952 New Hopes for a Changing World.

1953 Satan in the Suburbs and Other Stories.

1954 Nightmares of Eminent Persons and Other Stories.

1954 Human Society in Ethics and Politics.

1954 History as an Art.

1956 Portraits from Memory and Other Essays.

1956 Logic and Knowledge: Essays 1909 -1950. (Edited by Robert C. March.)

1957 Why I am not a Christian and Other Essays on Religion and Related Subjects. (Edited by Paul Edwards.)

1957 Understanding History and Other Essays. (Reprint of Earlier Essays.)

1958 The Will To Doubt. (Reprint of Earlier Essays.)

1959 Common Sense and Nuclear Warfare.

1959 My Philosophical Development.

1959 Wisdom of the West.

☆☆☆

رسل کی اہم تصنیفات کی تاریخ وار فہرست

1896	جرمنی کی اشتراکی جمہوریت
1897	اقلیدس کی مبادیات
1900	لائبنز کے فلسفہ کا ناقدانہ جائزہ
1903	اصول ریاضی
1910	اصول ریاضی جلد دوم)اے۔این وہائٹ ہیڈ کے اشتراک سے)
1910	فلسفیانہ مقالات
1912	اصول ریاضی جلد دوم (اے۔این وہاٹ ہیڈ کے اشتراک سے)
1912	مسائل فلسفہ
1913	اصول ریاضی جلد سوم (اے۔این وہائٹ ہیڈ کے اشتراک سے)
1914	فلسفہ میں سائنسی طریق کار کا میدان اور خارجی دنیا کا علم
1914	فلسفہ میں سائنسی طریق کار
1914	برگساں کا فلسفہ (ایچ۔ڈبلیو کار سے مباحثہ)
1915	جنگ، خوف کا شاخسانہ
1916	سماجی تشکیل نو کے اصول (انسان باہم کیوں لڑتے ہیں؟ بین الاقوامی چپقلش کو ختم کرنے کا ایک طریقہ)
1916	باہمی مفاہمت کی پالیسی (عدل وانصاف دوران جنگ کا ایک باب)
1916	جنگ کے زمانے میں عدل وانصاف
1917	سیاسی نصب العین
1918	تصوف منطق اور دوسرے مقالات
1918	آزادی کی شاہراہیں۔ اشتراکیت، نراج اور صنعتی ادارہ سازی
1919	ریاضیاتی فلسفہ کا تعارف
1920	بالشوزم، عمل اور نظریہ

1921	ذہن کا تجزیہ
1922	چین کا مسئلہ
1922	آزاد خیالی اور سرکاری پروپیگنڈا
1923	صنعتی تہذیب کا امکان (ڈورا رسل سے اشتراک کے ساتھ)
1923	ایٹم کی ابجد
1924	بالشوزم اور مغرب
1924	سائنس کا مستقبل
1924	آزاد اور خوش رہنے کا طریقہ
1924	منطقی جوہریت (ایٹمیت)
1925	اضافیت کی ابجد
1925	میرا عقیدہ
1926	تعلیم خصوصاً ابتدائی بچپن میں
1927	میں عیسائی کیوں نہیں ہوں؟
1927	مادہ کا تجزیہ
1927	فلسفہ کا خاکہ
1928	مقالات تشکیک
1929	ازدواج اور اخلاقیات
1930	مسرت کا حصول
1930	کیا مذہب نے تہذیب میں مفید کردار ادا کیا ہے؟
1931	سائنسی نکتہ نظر (اردو ترجمہ از ڈاکٹر نعیم احمد۔ اردو سائنس بورڈ)
1932	تعلیم اور سماجی نظام
1934	آزادی اور تنظیم
1935	در مدح تساہل اور دوسرے مضامین
1935	مذہب اور سائنس
1936	امن کا راستہ

1936 جبریت اور طبیعیات
1937 ایمبر لی یادداشتیں (والدین کے خطوط ار یادداشتیں)
1938 قوت' نیا سماجی تجزیہ
1940 معنی اور صداقت کی تحقیق
1945 تاریخ فلسفہ مغرب
1948 انسانی علم کی حدود
1949 اقتدار اور فرد
1950 نامقبول مضامین
1951 سائنس کے اثرات معاشرے پر
1952 بدلتی ہوئی دنیا کے لئے نئ امیدیں
1953 شیطان مضافات میں اور دوسرے افسانے
1954 بڑے لوگوں کے ڈراؤنے خواب اور دوسرے افسانے
1954 انسانی معاشرہ۔ اخلاقیات اور سیاست
1954 تاریخ بطور فن
1956 حافظے کا مدد سے مرقع جات اور دوسرے مقالات
1956 منطق اور علم(1909-50 کے درمیان لکھے گئے مقالات کا انتخاب از رابرٹ مارچ)
1957 میں عیسائی کیوں نہیں: مذہب اور اس کے متعلقات پر دوسرے مقالات۔
1957 تاریخ کی تفہیم اور دوسرے مقالات
1958 تشکیک کا جواز (بعض ابتدائی دور کے مقالات کی دوبارہ اشاعت)
1959 فراست اور ایٹمی جنگ
1959 میری فلسفیانہ نشوونما
1959 دانش مغرب

☆☆☆

چند بصیرت افروز اقوال

اس کی زندگی میں آوارہ خرامی کے باوصف ایک اس طرح کی ہم آہنگی تھی جو ابتدائی انیسویں صدی کے باغی اشراف کی یاد دلاتی تھی۔ (خود اپنی وفات پر) زیادہ عرصہ نہیں گزرا مجھے ایک اینگلیکن پادری کا مراسلہ ملا تھا۔ جس میں اس نے یہ کہا تھا کہ میری تمام آراء جنسی ہوس کی تحریک کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ کہ جن آراء کا میں نے اظہار کیا تھا وہ دوسری جنگ عظیم کے اسباب میں شامل تھیں۔ (بی بی سی پر جان فری مین کو انٹرویو۔ لسنر 19 مارچ 1959ء)

انسانی کردار کے ایک پہلو کی حیثیت سے، اکتاہٹ پر توجہ مطلوبہ حد تک مرکوز نہیں کی گئی۔ (خوشی کا حصول)

ہر شخص خدا بننا چاہتا ہے بشرطیکہ یہ ممکن ہو۔ عجب یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اسے خارج از امکان ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ (قوت: نیا سماجی تجزیہ)

ایک عہد یا ایک قوم کے عقائد اور سیاسیات میں اقتصادی امور کی اہمیت کے باوجود میں یہ نہیں سمجھتا کہ غیر اقتصادی عناصر کو ایک ایسی غلطی کا خطرہ مول لئے بغیر یکسر نظر انداز کیا جا سکتا ہے' جو عملاً مہلک ثابت ہو سکتی ہو۔ (بالشوزم' نظریہ اور عمل)

وہ تشکیک جس کا میں مویدّ ہوں، صرف یہاں تک محدود ہے کہ (۱) ماہرین کی متفقہ رائے کے مقابلے میں کسی متضاد رائے کو یقینی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (۲) اور یہ کہ جب ماہرین کسی بھی ایک بات پر متفق نہ ہوں تو ایک عام آدمی کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ کسی ایک رائے کو حتمی سمجھ لے۔ (۳) اور یہ کہ جب وہ یہ کہہ دیں کہ کسی بھی ایک رائے کا اثبات ممکن

نہیں تو عام آدمی کو اپنا فیصلہ معرض التواء میں ڈال دینا چاہئے۔ (مقالات تشکیک)

میرا مقصد تو یہ ہے کہ تقلید اور آزادہ روی' دونوں کے علی الرغم، سوچ بچار کا راستہ ہموار کروں۔ اور کسی حالت میں بھی عقل و دانش کو اخلاقی ڈھکوسلوں کی بھینٹ نہ چڑھاؤں۔ (تعلیم، خصوصاً ابتدائی بچپن میں)

دانش سے میری مراد ہے زندگی کے مقاصد کا صحیح شعور۔ سائنس از خود یہ تصور پیش کرنے سے معذور ہے۔ چنانچہ سائنس کی مجرد ترقی کسی صحتمند ارتقاء کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ البتہ وہ ایک جزو ترکیبی ضرور مہیا کرتی ہے جس کا منجملہ اور اجزاء کے ارتقاء محتاج ہوتا ہے۔ (سائنسی بچپن میں)

وہ خاص چیزیں جو کسی مقصد کے حصول کے لئے بذات خود اہمیت کی حامل ہیں' میرے نزدیک علم' فن' جبلی سرخوشی اور دوستانہ مراسم یا باہمی شفقت ہیں۔ (چین کے مسائل)

جبلت' ذہن' روح، ایک بھرپور زندگی کے لئے یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی خوبیاں اور خرابیاں ہیں۔ (ذہن کا تجزیہ)

بالفعل ہمارے ہاں دو قسم کے اخلاقی نظام ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک وہ جس کی ہم تبلیغ کرتے ہیں لیکن خود اس پر عمل پیرا نہیں۔ دوسرا وہ جس پر ہم خود تو عمل پیرا ہیں لیکن اس کی تلقین نہیں کرتے۔ (مقالات تشکیک)

کوئی قوم بھی اس حد تک راستباز نہیں ہوتی جتنا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھتی ہے اور نہ ہی کبھی کوئی قوم اتنی بدکردار ہوتی ہے جتنا کہ دوسری قوم اسے سمجھتی ہے۔ (انصاف دوران جنگ)

اگر ایک لمحے میں انسان کو بندر سے نسلی یگانگت کی بناء پر اپنا وقار مجروح ہوتا نظر آئے تو وہ جلد ہی اس کی بحالی کے لیے راستہ ڈھونڈ نکالتا ہے اور یہ راستہ ہے فلسفہ ارتقاء۔ وہ عمل جس کے ذریعے وہ امیبا سے انسان تک پہنچا ہے۔ اس میں فلسفی کو ترقی ہی ترقی نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ امیبا کو بھی یہ بات قبول ہو گی (خارجی دنیا کا کالم)

سائنس کی طرح۔ فلسفہ کو بھی جزئیات اساس ہونا چاہیے اور مشروط۔ کیونکہ اصل حقیقت تو اگلی دنیا ہی میں ظاہر ہو گی نہ کہ اس دنیا میں (فلسفے کا خاکہ)

وہ آراء جنہیں ہم عزیز رکھتے ہیں اکثر قوی بنیادوں سے محروم ہوتی ہیں۔ بیشک جوش و

جذبہ انسان کی عقلی تہی مائیگی کا آئینہ دار ہوتا ہے (مقالات تشکیک)

دنیا کی عافیت۔ یقین اور جرأت میں ہے۔ یقین تعقل پر۔ اور جرأت اس بات کا اعلان کرنے میں جسے تعقل برحق قرار دے (صنعتی تہذیب کا امکان)

بیشک شیطان جوانی کو بہکاتا ہے کہ وہ زندگی سے لطف اندوز ہو۔لیکن کیا یہ وہی تو نہیں جو بڑھاپے کو لطف اندوزی سے تعرض پر اکساتا ہے۔لیکن یوں تو نہیں کہ بوڑھوں کی یہ نفریں دراصل وہ لذت کا ہیجان ہے جو بڑھاپے کے لیے موزوں ہے (نوبیل انعام پانے کے موقع پر تقریر)

وہ شخص جو تسلی بخش توہمات کے بغیر زندگی کے خطرات کا سامنا نہیں کر پاتا وہ یقیناً نہ صرف کمزور ہے بلکہ قابل نفریں بھی (انسانی معاشرے میں اخلاقیات اور سیاسیات)

غلطی کے امکانات کی کوئی حد ہی نہیں اور اکثر فاتر العقل لوگ، غیر مقبول غلطیوں کو ناپسندیدہ حقائق پر ترجیح دیتے ہیں (نامقبول افسانے)

کروسیا والوں نے فیثا غورث کے مدرسے کو جلا ڈالا۔لیکن مکانوں کو یا مکینوں کو جلا دینا بہرحال جدت پسندی کو روکنے میں ہمیشہ بری طرح ناکام رہا ہے۔ (دانش مغرب)

☆☆☆

میری ذہنی نشوونما

میری عمر ابھی دو برس ہی تھی کہ میری والدہ فوت ہوگئیں۔ تین سال کی عمر کو پہنچا تو والد بھی وفات پا گئے۔ چنانچہ میری پرورش میرے دادا کے ہاں ہوئی۔ لارڈ جان رسل۔ بعد میں وہ ارل رسل کہلائے۔ مجھے اپنے والدین کے متعلق بہت کم بتایا گیا' میرے لئے ان کا وجود ایک موہوم المیہ چیستاں بن کر رہ گیا تھا۔ کہیں اکیسویں سال کو پہنچنے پر مجھے ان کی زندگی کے حالات اور ان کے ذہنی رجحانات کا علم ہوا۔ اس وقت مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں بھی بہت حد تک ٹھیک انہی ذہنی اور جذباتی مراحل سے گزرا ہوں۔ جو میرے والد کو پیش آئے تھے۔

میرے والد سے یہ توقع وابستہ کی گئی تھی کہ وہ رسل خاندان کی روایات کے مطابق سیاسی زندگی اپنائیں گے۔ وہ بھی رضامند تھے۔1867-68ء کے درمیان تھوڑے سے وقت کے لئے وہ پارلیمنٹ کے رکن بھی رہے۔ تاہم ان کا مزاج اور ذہنی رجحانات سیاست کے میدان میں کامیابی کے لئے موزوں نہ تھے۔ اکیس برس کی عمر میں انہوں نے عیسائیت کو خیر باد کہا اور کرسمس کے موقعہ پر گرجا جانے سے انکار کر دیا۔ دراصل وہ جان سٹوارٹ مل کے شاگرد ہو گئے تھے۔ بعد میں یہ تعلق دوستی میں بدل گیا۔ چند برس پیشتر مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہی صاحب (ایک غیر دینی حوالے سے) میرے دینی باپ تھے۔ اور میرے پیرومرشد۔ میرے والدین نے مل کے اعتقادات (آراء) کو تمام تر قبول کر لیا تھا۔ نہ صرف ان کو جنہیں نسبتاً زیادہ پذیرائی ملی۔ بلکہ ان آراء کو بھی جو ابھی تک عوامی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے باعث رائے عامہ کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ مثلاً خاندانی منصوبہ بندی یا خواتین

کے لئے ووٹ کا حق1868ء کے الیکشن/انتخابات کے دوران جس میں والد بھی ایک امیدوار تھے اس بات کو بہت اچھالا گیا کہ ایک نجی نوعیت کے مختصر سے مجمع میں انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ خاندانی منصوبہ بندی دراصل طبی ماہرین کا مسئلہ ہے۔ اس بات پر ان کے خلاف کردار کشی اور تحقیر کا ہر حربہ آزمایا گیا۔ ایک کیتھولک پادری نے یہ قرار دیا کہ یہ شخص ''قتل بچگان'' کی تعلیم دے رہا ہے۔ اخباروں میں انہیں نجس' بدزبان اور اوباش کے خطابات سے نوازا گیا۔ انتخابات کے دن ایسے کارٹونوں کی نمائش کی گئی جن میں انہیں بداخلاقی سے منسوب کیا گیا تھا۔ ان کے نام کو بگاڑ کر' بدی کا نمائندہ' ایمبر لے لکھا گیا۔ (اصل لفظ Vice-Count ہے جو ایک خطاب ہے لیکن Vice کو الگ پڑھنے سے بدی کا مفہوم نکلتا ہے) اور ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ''فرانسیسی اور امریکی نظام کے مبلغ ہیں۔'' ان حربوں کے باعث وہ الیکشن ہار گئے۔ تقابلی معاشرت (عمرانیات) کے طالبعلم کے لئے1868ء میں انگلستان کے دیہی اور نیویارک کے شہری تمدن کا موازنہ اور ان کے مابین مماثلت دلچسپی کا باعث ہوگی۔ اس ضمن میں دستیاب تحریریں ہم میاں بیوی نے ''ایمبر لی یادداشتوں'' میں یکجا کر دی ہیں۔ قارئین کتاب دیکھیں گے کہ میرے والد کم آمیز' علم دوست اور کٹر اصول پرست تھے۔ انہیں زعم پرست (خود پسند) تو کہا جا سکتا ہے' لیکن وہ اوباش قطعاً نہ تھے۔

میرے والد نے سیاست کو خیرباد تو نہیں کہا' تاہم وہ کسی حلقے سے منتخب نہ ہو سکے اور ایک بڑی سی کتاب لکھنے میں مصروف رہے۔ جس کا موضوع تھا ''مذہبی عقیدے کی توضیح'' یہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ وہ سیاست میں بہرحال کسی طور کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی غیر معمولی علمی دیانت تھی۔ وہ اپنی کمزوریوں اور مخالفین کی خوبیوں کا اقرار کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتے۔ علاوہ ازیں ان کی صحت بھی اکثر خراب رہتی اور نتیجتاً وہ جسمانی توانائی سے محروم تھے۔

میری والدہ بھی ان کے ہم خیال تھیں اور ساٹھ کی دہائی میں نسوانی مساوات کے حق میں تقریریں کر کے لوگوں کو ناراض کر لیا۔ وہ ''نسوانی حقوق'' جیسی تراکیب استعمال کرنے سے گریز کرتی تھیں۔ اور ایک پکی افادیت پسند کی حیثیت سے وہ ''فطری حقوق'' کی منکر تھیں۔

میرے والد کی خواہش تھی کہ ہم دونوں بھائیوں کی تربیت آزاد خیال مسلک کے

مطابق ہو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے دو آزاد خیال سرپرست/اتالیق بھی مقرر کر دیئے تھے۔ تاہم عدالت نے میرے دادا، دادی کی درخواستوں پر ان کی وصیت کو منسوخ کر دیا اور اس طرح مجھے عیسائیت کی آغوش میں پرورش کا موقع نصیب ہوا۔

1876ء میں جب مجھے والد کی وفات کے بعد ددھیال میں لایا گیا تو دادا کی عمر 83 سال تھی اور وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے بعض دفعہ انہیں پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر گھمانے پھرانے کے لئے باہر لایا جاتا تھا، یا میں انہیں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے پارلیمنٹ کے مباحثوں کی رپورٹ پڑھتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔ اور کبھی بچوں کے شوروغل کا بُرا نہ مانتے تھے۔ تاہم اپنی ضعیف العمری کے باعث وہ براہ راست میری تربیت پر اثر انداز نہ ہو سکے۔1878ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے متعلق بیشتر معلومات مجھے میری دادی سے حاصل ہوئیں جنہوں نے انہیں ہمیشہ احترام سے یاد رکھا۔ میرے عام نکتہ نظر کی تشکیل میں دوسروں کے مقابلے میں میری دادی کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے اگرچہ عنفواں شباب کے بعد مجھے اکثر ان کی آراء سے اختلاف ہی رہا۔

میری دادی مذہباً سکاچ پریس بے ٹیرین تھی۔ ان کا دور کا تعلق ایلیٹ خاندان سے تھا۔ ان کے نانا کو اس بات پر طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ انہوں نے ایٹنا کی ڈھلوانوں پر لاوا کی تہہ کی دبازت کی بنا پر یہ دعویٰ کیا تھا کہ کرہ ارض4004 قبل از مسیح سے پیشتر میں وجود میں آیا۔ ان کے پڑنانا رابرٹسن چارلس پنجم کے عہد کے تاریخ نویس تھے۔

عقیدتاً وہ پیورٹین تھیں۔ اور ان کے ہاں وہی بے لچک اخلاقیات پائی جاتی تھیں جو راہبوں کی خانقاہوں میں نظر آتی ہیں آرام سے گریز، غذا سے لاپروائی، شراب سے نفرت حتیٰ کہ تمباکو کو بھی محرمات میں شمار کرتی تھیں۔ اگرچہ1866ء تک جب میرے پردادا نے عملی زندگی ترک کی، ان کی تمام زندگی دینوی ہنگاموں میں گزری۔ تاہم وہ قطعاً دنیادار نہیں تھیں۔ روپے پیسے یا مال و دولت سے وہ اس خاص بے اعتنائی کی حامل تھیں جو صرف صاحب فراغت لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے بچے اور پوتے مفید اور نیک زندگی گزاریں۔ اور وہ چیزیں جنہیں عام لوگ کامیابی کا معیار سمجھتے ہیں، ان کے پیچھے نہ بھاگیں اور نہ ہی وہ امیر خاندانوں میں بیاہے جائیں۔ پروٹسٹنٹ فرقے کی طرح وہ ذاتی

نجی فیصلوں کے حق میں تھیں اور انفرادی ضمیر کی برتری کی قائل' میری بارھویں سالگرہ پر انہوں نے مجھے ایک انجیل کا نسخہ دیا تھا۔ (جواب بھی میرے پاس ہے) اور اس کے اندرونی صفحے پر اپنی پسندیدہ آیات اپنے ہاتھ سے لکھی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی ''تو برائی کرنے والے گروہ کی پیروی نہیں کرے گا'' دوسری یوں تھی ''طاقتور اور بہادر بنو۔ نہ تم ڈرو گے، نہ مایوس ہو گے' کیونکہ جہاں بھی تم جاؤ گے' تمہارا خداوند تمہارے ساتھ ہو گا۔'' ان آیات نے میری زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں' اگرچہ اب خدا پر سے میرا ایمان اٹھ گیا ہے۔ تاہم ان کی معنویت یکسر ختم نہیں ہوئی۔

70 برس کی عمر میں انہوں نے یونیٹیرین مسلک اختیار کر لیا۔ اور ساتھ ہی آئرلینڈ کے لئے داخلی خود مختاری کی حمایت شروع کر دی۔ چنانچہ انہوں نے پارلیمنٹ کے ان آئرستانی اراکین سے ربط و ضبط بڑھا لیا جنہیں علی الاعلان قتل میں ملوث کیا جا رہا تھا۔ اس سے عوام کو جو صدمہ پہنچا ہو گا اس کا آج اندازہ لگانا مشکل ہے۔ وہ بڑی شد و مد کے ساتھ استعماریت کی مخالفت کرتی تھیں۔ انہی کے زیر اثر میں افغانستان اور زولو میں جنگ کو بُرا سمجھنے لگا۔ یہ جنگیں اس وقت ہوئیں جب میں ابھی سات سال کا تھا۔ مصر پر قبضہ کے متعلق البتہ انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ اس میں گلیڈ سٹون کا ہاتھ تھا، جسے وہ پسند کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی جرمن گورنس سے وہ بحث اب تک یاد ہے جس میں اسے اصرار تھا کہ انگریز ایک دفعہ مصر میں داخل ہو گئے تو پھر اپنے تمام تر وعدوں کے باوجود کبھی وہاں سے نہیں نکلیں گے۔ جبکہ میں حب الوطنی کے جذبے کے ماتحت اس بات کا دعویدار تھا کہ انگریز کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ یہ ساٹھ سال پہلے کی بات ہے اور انگریز آج تک مصر سے نہیں نکلے۔

میری دادی کے خیال کے مطابق دادا اس چیز کو ناگزیر فطری تقاضا سمجھتے تھے کہ انسانیت کی بھلائی کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ مجھے بتایا گیا کہ انہوں نے 1832ء میں اصلاحات کا ایک بل پیش کیا تھا' ان کی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر چرچ کے مخالفین / (منکرین چرچ) کا ایک وفد ان سے ملا تھا۔ 50 سال پیشتر انہی لوگوں پر بعض سیاسی پابندیوں کو اٹھائے جانے کی مہم میں انہیں قائدانہ حیثیت حاصل تھی۔ ان کے کمرے میں اٹلی کا بنا ہوا ایک بت تھا۔ جس پر یہ عبارت کندہ تھی A Lord John Russell, L"Italia

Riconoscente ۔ جو حکومت اطالیہ نے انہیں پیش کیا تھا۔ قدرتی طور پر مجھے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ اس کا مطلب کیا ہے اور اس کا پس منظر کیا تھا' چنانچہ مجھے گاری بالدی اور اطالوی اتحاد کی پوری داستان سنائی گئی۔ یہی وہ چیزیں تھیں جنہوں نے میرے اندر بھی بامقصد زندگی گزارنے کے لیے ولولہ پیدا کیا۔

دادا جان کا لائبریری جو دراصل میرا مکتب بنی' مجھ پر ایک مختلف انداز میں اثر انداز ہوئی۔ وہاں زیادہ تر تاریخ کی کتابیں تھیں جن میں سے کچھ تو بہت پرانی تھیں' مثلاً مجھے بالخصوص سولہویں صدی کی ایک کتاب آج تک یاد ہے۔ تین جلدوں میں ایک اور ضخیم کتاب تھی L, Art de verifier les dates۔ یہ اتنی بھاری بھرکم تھیں کہ میں اس عمر میں انہیں اٹھانے سے بھی معذور تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کچھ اس قسم کی چیز ہو گی جیسے ''کتاب دعا'' میں وہ جدولیں ہوتی ہیں جن کی مدد سے ایسٹر کی تاریخیں نکالی جاتی ہیں۔ جب میں ذرا بڑا ہو کر انہیں اٹھانے کے قابل ہوا تو میں نے ان میں سے ایک جلد کو الماری میں سے باہر نکال کر دیکھا تو بہت بدمزہ ہوا کہ جس فن کا ذکر کیا گیا تھا' وہ صرف کتاب میں سے تاریخ معلوم کرنے پر مشتمل تھا۔ علاوہ ازیں "Four Masters" (چار اساتذہ) کی تاریخ آئرلینڈ تھی۔ یہاں میں نے ان اصحاب کا قصہ پڑھا جو ''طوفان'' سے پہلے آئرستان گئے تھے' اور ڈوب گئے تھے۔ میرے لئے اس داستان میں حیران کن بات یہ تھی کہ ''چار اساتذہ'' تک ان کی خبر کیونکر پہنچی۔ اس سے آگے میں نہ پڑھ سکا۔ اس کے علاوہ کچھ عام کتابیں تھیں مثلاً میکاولی' گبن' اور سوفٹ کی کتابیں۔ ایک کتاب چار جلدوں میں تھی جسے میں نے کبھی کھول کر بھی نہ دیکھا۔ یعنی کلیات آندریو مارویل صاحب ممبر پارلیمنٹ (رکن دارالعوام)۔ یہ مجھے کافی بڑی عمر میں جا کر معلوم ہوا کہ مارول تو ایک شاعر تھا نہ کہ سیاست دان' ان میں سے کوئی کتاب بھی میرے مطالعے کے لئے موزوں نہیں سمجھی گئی تھی۔ اور اگر یوں نہ ہوتا تو شاید میں ان میں سے کسی کو بھی نہ پڑھتا۔ ان کا مجموعی حاصل یہ تھا کہ تاریخ میں میری دلچسپی بڑھ گئی۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ اس دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگلستان کی تاریخ میں سولہویں صدی کے اوائل ہی سے میرے آباء کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ مجھے انگلستان کی تاریخ اس نکتہ نظر سے پڑھائی گئی تھی کہ انگلستان کی تاریخ میں سولہویں صدی کے اوائل ہی سے میرے آباء کو ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ مجھے انگلستان کی تاریخ

اس نکتہ نظر سے پڑھائی گئی تھی کہ وہ بادشاہ کے خلاف آئینی حقوق حاصل کرنے کی ایک مسلسل جدوجہد تھی۔ ولیم لارڈ رسل جنہیں چارلس دوم نے قتل کروا دیا تھا' احترام کے حق دار ٹھہرائے گئے۔ اس سے میں نے یہ جرأت آموز نتیجہ اخذ کیا کہ بغاوت اکثر و بیشتر قابل ستائش ہوتی ہے۔

میری زندگی میں 11 سال کی عمر میں ''اقلیدس'' کے مطالعہ کی ابتداء ایک اہم واقعہ ہے۔ اس وقت تک جیومیٹری کی یہی مستند تدریسی کتاب سمجھی جاتی تھی۔ پہلے تو مجھے اس پر مایوسی ہوئی کہ یہاں تو بات ہی مسلمات سے شروع ہوتی ہے۔ جنہیں ثبوت یا دلیل کے بغیر ہی قبول کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب یہ تاثر ختم ہوا' تو مجھے اس میں بہت لطف آنے لگا۔ اس کے بعد سے میرے بچپن میں اکثر و بیشتر علم ہندسہ بیحد دلچسپی کا باعث بنا رہا۔ (یہ دلچسپی کثیر الجہات تھی) اس دلچسپی کی گئی وجوہات تھیں' پہلی بات تو یہی زعم تھا کہ مجھے ایک خاص قسم کا ملکہ حاصل ہو گیا ہے۔ دوسرے استخراجی نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کا سرور۔ تیسرے ریاضیاتی تیقن کی اطمینان بخش کیفیت۔ چوتھے اور ان سب سے بڑھ کر (بچپنے ہی میں) یہ شعور کہ فطرت ریاضی کے اصولوں کے مطابق کام کرتی ہے۔ اور یہ کہ ستاروں کی گردش کے علم کی طرح انسانی اعمال کا تخمینہ بھی لگایا جا سکتا تھا۔ بشرطیکہ ہمیں اس مقصد کے لئے کافی مہارت حاصل ہو۔

اب میں پندرہ سال کی عمر کو پہنچ رہا تھا اور میں نے ڈیکارٹ ے مقلدین کی طرح یقین کی حد تک یہ سمجھ رکھا تھا۔ کہ زندہ اجسام کی حرکات بھی علم حرکیات کے اصولوں کے تابع ہیں۔ چنانچہ ارادہ کی آزادی صرف غلط فہمی ہی ہو سکتی ہے۔ تاہم چونکہ میں شعور کی بنیادی حیثیت کا قائل تھا، اس لئے مادیت کو قبول نہ کر سکا۔ البتہ یہ بات کہ مادیت علمی الجھاوے سے مبرا ہے اور ''نامعقول'' کو قبول نہیں کرتی' ہمیشہ میرے لئے باعث کشش رہی۔ میں اس وقت تک خدا کے وجود کو مانتا تھا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ غایت اولیٰ والی دلیل مجھے ناقابل تردید نظر آتی تھی۔

کیمبرج میں داخلے سے پہلے 18 سال تک میں نے زندگی تنہائی میں بسر کی۔ گھر میں مجھے جرمن نرس نے پالا پوسا' جرمن اور سوس خواتین میری اتالیق رہیں' اور آخر میں ایک انگریز اتالیق کی زیرنگرانی رہا۔ مجھے دوسرے بچوں سے ملنے کا بہت کم موقع ملا۔ اور کبھی ان

سے ملاقات ہوتی بھی تو میں انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں مذہب سے میرا شغف بہت بڑھ گیا تھا۔ اس دوران میں نے یکے بعد دیگرے سنجیدگی سے ان دلائل کا تجزیہ کیا جن کا تعلق ارادہ کی آزادی' بقاء دوام اور وجود باری سے تھا۔ چند مہینے مجھے ایک ایسے اتالیق سے واسطہ پڑا جو لاادری تھا۔ جس سے میں ان امور پر بحث کر سکتا تھا۔ لیکن اسے جلد ہی فارغ کر دیا گیا۔ شاید اس خیال سے کہ وہ میرے ایمان/عقیدے کو متزلزل کر رہا تھا۔ ان چند مہینوں کے علاوہ میں نے اپنے خیالات کو دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں انہیں ایک روزنامچہ میں یونانی رسم الخط/زبان میں قلمبند کر لیا کرتا تھا' جو عنفوان شباب میں تنہائی کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ تاہم میں نے اس افسردگی کا سبب مذہبی ایقان کے زوال کو ٹھہرایا، تین سال تک میں مذہب کے متعلق غور وفکر میں ڈوبا رہا اور یہ احتیاط برتی کہ میری خواہشات میری سوچ پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ پہلے تو میں نے ارادے کی آزادی کے تصور سے رجوع کیا۔ اور پھر بقاء کے تصورات سے۔ خدا پر ایمان 18 سال کی عمر تک برقرار رہا۔ تاآنکہ میں نے مل کی خودنوشت میں یہ فقرہ پڑھا۔ ''میرے والد نے مجھے یہ بات سمجھائی کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ مجھے کس نے پیدا کیا؟'' اسی لمحے مجھ پر یہ راز منکشف ہو گیا کہ غایت اولیٰ والی دلیل غلط محض ہے۔

ان ایام میں میں نے وسیع مطالعہ کیا' لیکن چونکہ یہ مطالعہ جہت سے محروم تھا' اس لئے زیادہ تر بے فائدہ ہی رہا۔ میں نے شعر کا مطالعہ بھی کیا لیکن میرا انتخاب ناقص تھا۔ مثلاً ٹینی سن اور بائرن۔ سترہ سال کی عمر میں میں شیلی سے متعارف ہوا جس کے متعلق مجھے پہلے سے کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ کئی سالوں تک ماضی کی عظیم ہستیوں میں سے اس کے ساتھ میرا سلسلہ مودت زیادہ گہرا رہا۔ میں نے کارلائل کو بھی بہت پڑھا۔ میں نے Past and Present کو تو بہت دلچسپ پایا۔ لیکن Sartor Resartus نے مجھے متاثر نہ کیا۔ جہاں تک The Everlasting Yea کا تعلق ہے میں اسے مہمل جذباتیت سے لبریز سمجھتا تھا جس شخص کی آراء سے مجھے اکثر و بیشتر اتفاق ہوتا تھا' وہ مل تھا اس کی تصانیف Political Economy Liberty اور Subjection of Women نے مجھے بالخصوص متاثر کیا۔ میں نے اس کی کتاب Logic کے تشریحی حواشی تیار کئے۔ تاہم میں اس کا یہ نظریہ قبول نہ کر سکا کہ ریاضیاتی قضئے فی الاصل تجرباتی کلئے ہیں۔ اگرچہ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ انہیں اس کے علاوہ کیا کہنا

چاہئے۔

یہ سب کیمبرج میں داخلے سے پہلے کے زمانے کی باتیں ہیں۔ سوائے ان تین مہینوں کے جن میں مجھے ایک لاادری اتالیق میسر آیا' (جس کا میں ذکر کر چکا ہوں) اور کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس سے میں اپنے خیالات کے متعلق گفتگو کر سکتا۔ گھر میں مذہب کے متعلق اپنے شکوک کو میں نے مخفی رکھا۔ ایک دفعہ میں نے کہیں یونہی کہہ دیا تھا کہ میں Utilitarian افادیت پرست ہوں۔ اس پر جو میری فضیحتی ہوئی اس کے پیش نظر پھر میں نے گھر میں کبھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔

کیمبرج نے مجھ پر بے انتہا مسرت کی ایک نئی دنیا کے دروا کئے۔ یہاں پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ میں جب اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں تو انہیں پذیرائی ملتی ہے۔ وائٹ ہیڈ نے' جنہوں نے داخلے کے موقعہ پر میرا امتحان لیا تھا' کئی لوگوں سے میرا ذکر کیا' جو مجھ سے دو ایک سال آگے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی ہفتے کے اندر میں کئی ایسے لوگوں سے ملا جن سے زندگی بھر کے لئے رشتہ مودت استوار ہو گیا۔ وائٹ ہیڈ جو اس وقت تک فیلو اور لیکچرر مقرر ہو چکے تھے' وہ مجھ سے اتنے بڑے تھے کہ ان سے چند سال بعد جا کر قریبی ذاتی دوستی کا تعلق قائم ہوا۔ میں نے اپنے ہم عصروں کے گروہ میں کچھ ایسے با صلاحیت مستعد اور محنتی لوگوں کو پایا' جو اپنے تدریسی مضامین کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ مثلاً شاعری' فلسفہ، سیاسیات' اخلاقیات' غرضیکہ ذہنی فتوحات کے تقریباً تمام شعبے۔ ہم ہفتہ (شنبہ) کی رات دیر تک بحث مباحثے میں الجھے رہتے۔ نتیجتاً اتوار کی صبح دیر سے ناشتہ کرتے اور پھر اتوار کا سارا دن سیر سپاٹے میں گزار دیتے۔ اس وقت تک ذہین نوجوانوں میں وہ احساس برتری اور سنک (خشک مزاجی) پیدا نہیں ہوئی تھی' جو کئی سال بعد رونما ہوئی۔ اور جسے پہلے پہل کیمبرج میں لٹن سٹریچی نے فیشن کا جزو بنا دیا۔ اس وقت دنیا میں ابھی امید کی روشنی باقی تھی۔ گویا وہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ ہم سب کو یقین تھا کہ انیسویں صدی میں حاصل ہونے والی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اور یہ کہ ہمیں خود بھی اس میں قابل قدر اضافہ کرنے کا اہل ہونا چاہئے۔ وہ لوگ جو 1914ء میں ابھی نوعمر تھے ان کے لئے ان ایام پارینہ کی مسرت و بہجت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

کیمبرج میں میرے کئی دوست تھے۔ مثلاً ہیگل کا پیرو میک ٹیگرٹ' لوئس ڈکنسن جس کی

نرم خوئی کا جادو جسے بھی وہ ملتا' اس کا گرویدہ بنا دیتا۔ چارلس سینگر' جو کالج کے ایام میں بہت قابل ریاضی دان تھا' لیکن بعد میں وکالت میں نام کمایا' قانونی حلقوں میں وہ Jarman on Wills کے مدیر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ دو بھائی کرامپٹن اور تھیوڈور لیولن ڈیویز جن کے والد ایک Broad Church کے پادری تھے۔ انہیں بالعموم ''ڈیویز اور واغان'' افلاطون کی جمہوریت کے مترجم کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ سات بھائی بہنوں کے کنبے میں یہ دونوں سب سے چھوٹے' لیکن سب سے زیادہ ذہین اور خاص قابلیت کے مالک تھے۔ ان میں دوست داری کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار تھے۔ اور نکتہ طرازی میں بے مثال۔ ان میں سے چھوٹا تھیوڈور۔ جس نے ابھی سرکاری ملازمت میں ایک شاندار سلسلے کا آغاز ہی کیا تھا' بدقسمتی سے نہاتے ہوئے (حادثے کا شکار ہو کر) ڈوب مرا۔ میں نے آج تک کوئی ایسے دو شخص نہیں دیکھے جنہیں دوست اتنی بڑی تعداد میں اور اس شدت سے چاہتے ہوں۔ جن لوگوں کے میں زیادہ قریب رہا۔ ان میں ٹریویلین خاندان کے تین بھائی بھی تھے۔ جو میکالے کے دوسری پشت میں بھتیجے ہوتے تھے۔ ان میں سے سب سے بڑا تو لیبر پارٹی کا سیاست دان تھا۔ تاہم اس نے لیبر پارٹی کی حکومت سے اس لئے استعفیٰ دے دیا کہ حکومت میں اس کے نزدیک سوشلسٹ رجحانات ناکافی تھے۔ دوسرا بھائی شاعر تھا۔ جس نے نظموں کے کئی مجموعے شائع کیے ہیں۔ جن میں لوکریشیئن کی شاعری کے شاندار تراجم بھی شامل تھے۔ تیسرے جارج نے تاریخ دان کی حیثیت سے نام کمایا۔ مجھ سے عمر میں قدرے کمتر جی ای مور بھی انہیں لوگوں میں شامل تھا۔ میں اپنے فلسفے پر اس کے اثرات کا معترف ہوں۔

جس گروہ میں میں شامل تھا' اسی پر میک ٹیگرٹ کے اثرات بہت نمایاں تھے۔ ہیگل کے فلسفے کو اس کی نکتہ طرازی نے قبولیت بخشی۔ یہ بات میں نے اسی سے سیکھی کہ برطانوی تجربیت' بہت خام ہے۔ چنانچہ میں یہ بات ماننے پر مائل تھا کہ ہیگل اور اس سے کچھ کمتر سطح پر کانٹ کے ہاں جو تبحر علمی پایا جاتا ہے وہ لاک' برکلے اور ہیوم حتیٰ کہ میرے پہلے گرومل کے ہاں بھی مفقود ہے۔ کیمبرج میں اپنے ابتدائی تین سالوں کے دوران میں ریاضی کے مطالعہ میں اتنا منہمک رہا' کہ کانٹ اور ہیگل کا مطالعہ نہ کر سکا۔ البتہ چوتھے سال میں میری توجہ فلسفے پر مرکوز رہی۔ میرے استادوں میں سجویک' جیمز وارڈ اور جی ایف سٹاوٹ شامل

تھے۔ جو یک زیادہ تر برطانوی مکتب فکر کی نمائندگی کرتا تھا۔ جس کے متعلق میں یہ سمجھتا تھا کہ مجھے اس پر دسترس حاصل ہے۔ چنانچہ ان دنوں میں نے ان کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ نہ دی۔ وارڈ سے مجھے ایک حد تک ذاتی وابستگی تھی۔ انہوں نے کانٹ کے نظام فلسفہ اور ساتھ ہی ساتھ مجھے لوٹزے اور میگ وارٹ سے بھی متعارف کرایا۔ ان دنوں سٹاوٹ بریڈ لے کے بہت معتقد تھے۔ جب Appearance and Reality۔ شائع ہوئی تو انہوں نے کہا کہ وجودیات کے ذیل میں جو کچھ انسانی سطح پر ممکن تھا' اس میں پیش کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے میک ٹیگرٹ کے ساتھ مل کر مجھے ہیگل کا معتقد بنا دیا۔ مجھے1894ء کا وہ لمحہ اچھی طرح یاد ہے جب ایک دن ٹرنے ٹی لین میں سے گزرتے ہوئے مجھ پر ایک تجلی کی صورت میں منکشف ہوا کہ وجودیاتی دلیل یقیناً جواز کی حامل ہے۔ میں تمباکو کا ڈبہ خریدنے کے لئے نکلا تھا' واپسی پر میں نے اچانک اسے ہوا میں اچھال دیا اور جب اسے پکڑا تو میں بڑبڑا رہا تھا۔ قسم سکاٹ کی۔ وجودیاتی دلیل صحیح ہے۔ اس موقع پر میں نے بریڈلے کا مطالعہ بڑے اشتیاق کے ساتھ کیا اور قریبی عہد کے سب فلسفیوں میں سے اس کو زیادہ پسند کرتا تھا۔

میں نے1894ء میں کیمبرج کو خیر باد کہا۔ اور بہت سا وقت اجنبی ملکوں میں گزارا۔ 1894ء میں چند مہینوں کے لئے میں پیرس میں برطانوی سفارت خانے میں اعزازی اتاشی رہا۔ یہاں مجھے ان لمبے چوڑے خطوط کو نقل کرنا ہوتا تھا۔ جن میں فرانسیسی حکومت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی تھی کہ جھینگا، مچھلی نہیں ہے۔ اس کے جواب میں فرانسیسی حکومت نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ1713ء میں جب معاہدہUtrecht پر دستخط ہوئے تھے اس وقت۔ تو اسے مچھلی ہی قرار دیا گیا تھا۔ مجھے سفارتی پیشے سے دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ میں نے دسمبر1894ء میں سفارت خانے کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے شادی کی اور1895ء کا تقریباً سارا سال برلن میں بسر کیا۔ یہاں میں نے اقتصادیات اور جرمن سوشلسٹ جمہوریت کا مطالعہ کیا۔ یہاں برطانوی سفیر کی بیگم میری عم زاد تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں رات کے کھانے پر سفارت خانے میں مدعو کیا۔ وہاں میری بیوی نے کہیں یہ ذکر کر دیا کہ ہم ایک سوشلسٹ اجتماع میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد سفارت خانے کے دروازے ہم پر مستقل طور بند ہوگئے، میری بیوی فلاڈلفیا کویکرQuaker عقیدے سے تعلق رکھتی تھی' 1896ء میں ہم نے تین مہینے امریکہ میں بسر کئے۔ سب سے پہلے ہم نے کیمڈن' نیوجرسی

میں والٹ وہٹمین کے گھر کی زیارت کی۔ میری بیوی اسے اچھی طرح جانتی تھی اور میں بھی اس کا بے حد مداح تھا۔ اس سیروسیاحت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میرے ذہن سے کیمبرج کا خبط کسی قدر کم ہوا۔ یہاں میں نے ویرنٹراس کا مطالعہ کیا جس کا ذکر میرے کیمبرج کے استادوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس سیاحت کے بعد ہم Sussex میں الگ تھلگ مکان میں رہنے لگے۔ اس کے ساتھ ہم نے ایک Work-Room اضافہ کر لیا تھا۔ ان دنوں میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں کوئی کام کئے بغیر گزر بسر کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں ہمہ وقت فلسفے اور ریاضی کے مطالعہ میں مصروف رہتا۔ بجز شام کے وقت کے جس میں ہم تاریخ خوانی کرتے۔

1894ء سے 1898ء تک کے درمیانی سالوں میں مجھے یہ تیقن حاصل رہا کہ کائنات کے متعلق اکثر و بیشتر مسائل جو ہمارے مذہبی احساسات کی رو سے اہم تھے، فلسفے کے ذریعے حل کئے جا سکتے ہیں اور میں نے فیصلہ کیا کہ بشرط اہلیت میں اپنی زندگی فلسفے کے لئے وقف کر دوں گا۔ میں نے اپنی فیلو شپ کے سلسلے میں مبادیات اقلیدس پر جو کچھ لکھا تھا۔ اسے وارڈ اور وائٹ ہیڈ نے بہت سراہا۔ اگر یوں نہ ہوتا تو میں اقتصادیات میں مگن ہو جاتا۔ جس کا مطالعہ میں نے برلن میں شروع کیا تھا۔ مجھے موسم بہار کی وہ صبح اچھی طرح یاد ہے، جب ٹیر گارٹن میں گھومتے ہوئے میں یہ منصوبہ بنا رہا تھا کہ سائنس کے فلسفے پر کتابوں کا ایک سلسلہ مرتب کروں گا۔ جس میں ریاضی سے' حیاتیات کی طرف بڑھتے ہوئے' میرا نکتہ نگاہ بتدریج معروضی ہوتا چلا جائے گا۔ ساتھ ہی میرا یہ بھی ارادہ تھا کہ میں سماجی اور سیاسی مسائل پر کتابوں کا ایک سلسلہ تصنیف کروں گا۔ جس میں بتدریج میری سوچ زیادہ تجریدی ہوتی چلی جائے گی۔ بالآخر میں ایک قاموس کی طرز کی کتاب میں ہیگل کے فلسفے کے اسلوب میں نظریے اور عمل کا امتزاج پیش کر سکوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس منصوبے کی تحریک ہیگل کے مطالعہ ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ اور میرے فلسفیانہ نکتہ نظر میں تغیر و تبدل کے باوجود اس کا کچھ نہ کچھ اثر و نفوذ قائم رہا ہے۔ اس لمحے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی اہمیت حاصل رہی ہے۔ میں آج بھی اپنے پاؤں تلے پگھلتی ہوئی برف کے ٹوٹنے کی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔ اور نم دار زمین کی باس جو موسم سرما کے ختم ہونے کی نشاندہی کرتی تھی۔ آج بھی شامہ نواز بنتی ہے۔

1898ء کے دوران کئی ایسی باتیں رونما ہوئیں جنہوں نے مجھے کانٹ اور ہیگل دونوں سے برگشتہ کر دیا۔ میں نے ہیگل کی کتاب Greater Logic پڑھی اور میں نے محسوس کیا اور یہ احساس اب بھی قائم ہے کہ ریاضیات کے ذیل میں اس نے جو کچھ کہا ہے' وہ سرتا سرخیرہ سری ہے۔ رشتوں کے خلاف بریڈلے کی دلیلیں بھی مجھے خام نظر آنے لگیں اور وحدت الوجود کی منطقی بنیاد پر سے میرا یقین متزلزل ہو گیا۔ ماورائی جمالیات کی موضوعیت مجھے ناگوار گزرتی' تاہم یہ سب محرکات شاید بہت سست رفتاری سے اثر پذیر ہوتے۔ ان کی یلغار تمام تر جی ای مور کی انہوں نے منت تھی۔ اس پر بھی ہیگل سے متاثر ہونے کا ایک دور گزر چکا تھا۔ لیکن اس کی مدت میری بہ نسبت بہت کم تھی۔ اس نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور میں نے اس کی پیروی کی۔ کہ اس میں ایک عافیت نظر آتی تھی۔ بریڈلے کا نظریہ یہ تھا کہ عام شعور جو کچھ محسوس کر سکتا ہے۔ وہ محض ایک مظہر ہے۔ چنانچہ ہم نے یہ متضاد نظریہ اپنایا کہ ہر وہ شے جو حواس کے پردے پر جلوہ گر ہوتی ہے' وہی حقیقت ہے' بشرطیکہ مذہب اور فلسفہ کی پرچھائیں اس پر نہ پڑی ہو۔ چنانچہ آزادی کے جذبے سے سرشار ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ گھاس فی الاصل سرسبز ہے۔ ستارے اور سورج بدستور موجود رہیں گے۔ خواہ کوئی ان کی موجودگی کو محسوس کرے یا نہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ قید زمانی سے ماوریٰ افلاطون کی اعیان کی متنوع دنیا بھی موجود ہے۔ کائنات جو اب تک بے مایہ اور منطقی نظر آتی تھی' یک لخت گراں مایہ' متنوع اور ٹھوس حقیقت میں بدل گئی۔ ریاضی کے نتائج یقیناً حقیقی ہوتے ہیں۔ اور صرف جدلیت کی ایک منزل کو ظاہر نہیں کرتے۔ اس نکتہ نظر کی میں نے ''لائبنز کا فلسفہ'' (Philosophy of Leibniz) میں کچھ توضیح کی ہے۔ دراصل یہ کتاب بھی ایک اتفاق کا نتیجہ تھی۔ 1898ء میں عام حالات کے مطابق میک ٹیگرٹ کو کیمبرج میں لائبنز پر لیکچر دینے تھے۔ لیکن وہ نیوزی لینڈ میں اپنے اہل خانہ سے ملنے کے لئے جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی جگہ مجھے یہ درس مکمل کرنے کے لئے کہا گیا۔ یہ اتفاق میرے لئے بہت مبارک ثابت ہوا۔

میری علمی زندگی میں 1900ء کے سال کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس سال کا اہم ترین واقعہ پیرس میں ہونے والی بین الاقوامی فلسفہ کانگریس میں میری شرکت تھی۔ گیارہ سال کی عمر سے جب میں نے اقلیدس کے اسباق شروع کئے تھے' میں ریاضیات کی مبادیات

کے بارے میں ہمیشہ مذبذب رہا۔ بعد میں جب میں نے فلسفہ پڑھا، تو میں نے دیکھا کہ کانٹ اور دوسرے تجربیت پسند بھی مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ مجھے قبل از تجربہ امتزاج ناپسند تھا۔ تاہم ریاضی میں تجرباتی کلیات نہیں تھیں۔1900ء کی کانگرس میں مجھے اس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا کہ ہر نہج کی بحث میں پے آن(Pean) اور اس کے شاگرد جس قطعیت کے ساتھ بات کرتے تھے وہ دوسروں کو میسر نہ تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی تصنیفات مجھے عطا کریں۔ انہوں نے اپنی کتابیں مجھے دیں۔ جونہی میں نے ان کی دی ہوئی اشاراتی تراقیمNotations پر عبور حاصل کیا' مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ ریاضیاتی قطعیت کو پیچھے کی طرف ان مقامات تک لے جاتی تھیں جو فلسفیانہ ابہام کا شکار ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس بنیاد پر کام کرتے ہوئے میں نے تناسبات کے لئے ایک ترقیم ایجاد کی۔ خوش قسمتی سے وہائٹ ہیڈ نے بھی اس طریق کار کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اکٹھے کام کرتے ہوئے ہم نے ترقیمی' توصیفی وغیرہ اعداد کی تعریف مہیا کر کے ریاضی کو منطق سے ملا دیا۔ تقریباً ایک سال تک ہمیں مسلسل جلدی جلدی کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں۔ اس ضمن میں بہت سا کام تو فریجے پہلے ہی کر چکا تھا۔ لیکن اپنے کام کے آغاز میں مجھے اس کے متعلق علم نہیں تھا۔ اصول ریاضیات میں وہ مسائل جو بالآخر میری شناخت قرار پائے' وہ پہلے پہل مجھے کانٹ کے رد میں ضمنی طور پر سوجھے تھے۔

جون1901ء میں خوشیوں کا یہ ریلا اپنے اختتام کو پہنچا، کینٹر نے یہ ثابت کیا تھا کہ سب سے بڑا توصیفیCardinal عدد کوئی نہیں۔ اس ثبوت کو جب میں نے یونیورسل کلاس پر لاگو کیا تو میں ان کے متعلق اس متضاد نتیجے پر پہنچا کہ ایسے مجموعے بھی ہیں' جو اپنی ہی حد بندی کو قبول نہیں کرتے۔ جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ تو لامتناہی تناقصات (تضادات) کی صرف ایک مثال تھی۔ میں نے اس سلسلے میں فریجے سے خط و کتابت کی۔ اس نے بھی کمال سنجیدگی سے جواب دیا۔

ابتداء میں میرا خیال تھا کہ یہ ایک معمولی مسئلہ ہے اور آسانی سے حل ہو جائے گا۔ لیکن یہ امیدیں جلد ہی ناامیدی میں بدل گئیں۔1903ء اور1904 ء کے دوران میں اس عقدہ لانیحل میں الجھا رہا۔ لیکن آگے نہ بڑھ سکا۔ بالآخر1905ء میں ایک اور مسئلے نے جو بآسانی حل ہو گیا' امید کی کرن دکھائی۔ یہ مسئلہDescriptions کا تھا۔ اور اس کے حل نے

ایک نئے طریق کار کی راہ سجھائی۔

متکلمانہ حقیقت پسندی ایک مابعد الطبیعاتی نظریہ ہے۔ لیکن ہر مابعد الطبیعی نظریہ کا ایک فنی یا تکمیلی شق بھی ہوتا ہے۔ میں متکلمانہ یا افلاطونی رنگ میں حقیقت پسند تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ Cardinal Integers توصیفی ہند سے۔ ایک لازمانی وجود رکھتے ہیں۔ جب ہندسوں کی گروہ بندی کی جاتی ہے تو یہی وجود گروہی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ میناتگ (جس کی تصنیفات میری دلچسپی کا باعث تھیں)، حقیقت پسندانہ دلیلوں کا اطلاق بیانیہ جملوں پر کرتا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سونے کے پہاڑ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ ایک صحیح مفروضہ ہے۔ اس میں ایک مبتداء موجود ہے یعنی سنہری پہاڑ۔ اور اگر یہ مبتداء کسی وجود کی نمائندگی نہیں کرتا، تو مفروضہ لایعنی ہو جاتا ہے۔ میناتگ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ سونے کا پہاڑ، سنہری بھی ہے اور پہاڑ بھی۔ تاہم اپنا وجود نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ''سونے کا پہاڑ'' ایک موجود ہے، پھر بھی وجود نہیں رکھتا۔ مجھے اس سے تشفی نہیں ہوئی۔ چنانچہ میناتگ کا یہ بلاوجہ شہرت پا لینے والا وجودی کائنات کا نظریہ ہی مجھے Descriptions کے نظریئے تک لے گیا۔ اس نظریہ کا اہم نکتہ یہ تھا ایک بامعنی جملے کی توضیح کرتے ہوئے ہمیں یہ فرض نہیں کر لینا چاہئے کہ اس کا ہر جزو اپنے طور پر بھی بامعنی ہے۔ سونے کا پہاڑ ایک بامعنی جملے کا حصہ ہوسکتا ہے۔ لیکن الگ طور پر اپنی جگہ بامعنی نہیں ہے۔ چنانچہ جلد ہی یہ واضح ہو گیا کہ گروہی نشانات کو Descriptions کے ذیل ہی میں شمار کرنا چاہئے یعنی وہ بامعنی جملے کے بے معنی اجزاء ہیں۔ اس طرح ایک عمومی انداز میں یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ تضادات کا حل ممکن ہے۔ اصول ریاضی میں جو خاص حل پیش کیا گیا ہے وہ کئی خرابیوں سے مملو ہے تاہم اس سے یہ تو ظاہر ہوا کہ منطق کی راہ مطلقاً مسدود نہیں ہو چکی۔

Descriptions کے نظریئے اور تضادات کا حل ڈھونڈنے کے دوران مجھے معانی اور Significance کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ معانی بمقابلہ الفاظ اور Significance بحوالہ جملہ ایک الجھا ہوا معاملہ ہے۔ میں نے اپنی دو کتابوں The Analysis of mind (1921), An Inquiry into Meaning and Truth (1940) میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں نفسیات اور عضویات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ میں نے اس بحث پر جتنا زیادہ غور کیا، اتنا ہی مجھ پر یہ واضح ہوتا چلا گیا کہ منطق خود مختار حیثیت کی حامل نہیں ہے۔ یہ

جانتے ہوئے کہ منطق، نفسیات کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ قطعیت کا حامل علم ہے یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، اس مسائل کی حد بندی کر دی جائے جنہیں منطقی طریق سے سلجھایا جا سکتا ہے۔ یہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ Occam کا طریقہ کار مفید مطلب رہے گا۔

Occam کا طریقہ کار اپنی بنیادی حیثیت میں مابعد الطبیعیاتی تھا۔ یہ حقیقی وحدتوں کی کفایت کا اصول تھا۔ اصول ریاضی کی تصنیف کے دوران میرا اس موضوع کے متعلق یہی ردعمل رہا۔ افلاطون کے توصیفی اعداء ماورائے زمان ہیں۔ فریجے (Frege) کا بھی نکتہ نظر یہی ہے۔ ان اعداد کی یہ تعریف کہ مجموعوں کا مجموعہ ہوتے ہیں اور اس دریافت نے کہ مجموعے کے نشانات، نامکمل نشانات ہو سکتے ہیں۔ مجھے یہ ماننے پر مجبور کیا کہ توصیفی عدد کو مکمل وحدت قرار دینا ضروری نہیں۔ لیکن فی الاصل جس مسئلے کی تشریح کی گئی تھی وہ مابعدالطبیعیات کی ذیل میں نہیں آتا تھا۔ کیونکہ جس امر کی وضاحت کی گئی تھی، وہ یہ تھا جسے Minimum Vocabolaries کی اصطلاح میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ مختصر ترین لفظیات سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کی کسی دوسرے لفظ کی مدد سے تشریح نہ کی جا سکے۔ نظریاتی اعتبار سے تمام تعریفیں فضول ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر علم کو اس کے لئے مخصوص مختصر ترین لفظیات میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ پیانو نے ریاضیاتی کی مخصوص لفظیات کو تین اصطلاحوں تک محدود کر دیا۔ فریجے نے اور اصول ریاضی میں بھی یہ صراحت کی گئی کہ تین بھی غیر ضروری ہیں اور یہ کہ ریاضی کے لئے بھی مختصر ترین لفظیات وہی ہیں جن سے منطق میں کام لیا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ خالص تکنیکی نوعیت کا ہے اور اس کا صحیح حل ممکن ہے۔

تاہم اس طریق کار سے Minimum Vocabularies سے نتائج اخذ کرنے کے لئے انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک ہی موضوع کے لئے ہمیشہ نہیں تو اکثر مختلف لفظیات کا وجود پایا جاتا ہے۔ مثلاً تفاعل صداقت (Truth Function) کے اصول کے مطابق ''عدم الف یا عدم ب'' اور اس کے مقابلے میں ''عدم الف اور عدم ب'' دونوں تعریف سے عاری ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کو دوسری پر برتری حاصل نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو بظاہر تعریف نظر آتی ہے وہ دراصل تجربی مفروضہ نہیں ہوتا۔ فرض کیجئے میں سرخ کی یہ تعریف پیش کرتا ہوں ''وہ بصری حسیات جو ایک خاص طول موج سے وجود پذیر

ہوتی ہیں'' اگر ہم یہ جان لیں کہ سرخ کا مطلب واقعی یہی ہے تو پھر بصریات میں نظریہ تموج اور تموج کی پیمائش سے پہلے اس لفظ کے متعلق کوئی مفروضہ بھی قابل فہم نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم لفظ سرخ ان نظریات سے پہلے بھی معرض استعمال میں آتا تھا۔ چنانچہ یہ لازم آتا ہے کہ جہاں جہاں بھی لفظ سرخ استعمال ہوا، اس کا مفہوم وہ نہیں ہوتا جو اوپر دی گئی تعریف سے مترشح ہوتا ہے۔ اب اس مثال پر غور کیجئے۔ ''جو کچھ ہم رنگوں کے متعلق جانتے ہیں' کیا ایک نابینا شخص بھی اس کا علم رکھتا ہے؟'' اوپر کی تعریف کے مطابق جواب ہاں ہوگا۔ لیکن عام روزانہ پیش آنے والے تجربات کی رو سے جواب نفی میں ہوگا۔ یہ مسئلہ اس بات کا آئینہ دار ہے کہ نئی منطق بھی ارسطو کی منطق کی طرح ہمیں تنگ نظری کا شکار بنا سکتی ہے۔

البتہ ایک نتیجہ مختصر ترین لفظیات سے اخذ کرنا میرے نزدیک جائز ہے۔ مثال کے طور پر مسلمات کے روایتی لیکن اہم مسئلہ ہی کو لیجئے۔ یہ بات کم و بیش یقینی ہے کہ کوئی بھی لغت ان الفاظ سے مکمل طور پر پیچھا نہیں چھڑا سکتی جو کسی نہ کسی حد تک ''مسلمات'' کی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ الفاظ کبھی اسماء نہیں ہوسکتے۔ انہیں صرف صفات یا افعال ہی کی صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں صرف ایک لفظ کفایت کرے گا۔ یعنی مشابہ۔ یہ ہمیں ''مشابہت'' کے لفظ کے استعمال سے مستثنٰی کر دیتا ہے۔ (اس کے ہوتے ہوئے لفظ مشابہت استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔) لیکن یہ امر کہ لفظ ''مشابہ'' ہمارے لئے ناگزیر ہے' صرف زبان ہی کے متعلق نہیں بلکہ کائنات کے متعلق بھی کسی حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ البتہ میں یہ نہیں جانتا کہ کائنات کے متعلق جس حقیقت کو یہ لفظ ظاہر کرتا ہے، وہ کیا ہے۔

مختصر ترین لفظیات کے ایک اور استعمال کا تعلق تاریخی واقعات سے ہے۔ تاریخ نویسی کے لئے ہمیں ایک ایسی زبان کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک ایسے واقعہ کو ظاہر کر سکے جو صرف ایک ہی دفعہ وقوع پذیر ہوا ہے۔ مثلاً سیزر کی موت۔ منطق سے غیر ضروری شغف جس کا تعلق تاریخ سے نہ ہو ہمیں اس ضرورت سے غافل کر سکتا ہے۔ زمانی مکانی اضافیت نے اس ضرورت کی تکمیل کے امکان کو نسبتاً اور بھی کم کر دیا ہے۔ جتنا نیوٹن کے نظریہ کائنات کی ذیل میں ممکن تھا جس کی رو سے نکات اور لمحات تخصیص کے ضامن تھے۔

چنانچہ عمومی حیثیت سے مختصر لفظیات اس وقت زیادہ کارآمد ہوتی ہیں جب وہ یہ ظاہر

کرتی ہیں کہ ایک خاص اصطلاح ناگزیر ہے نہ کہ اس حالت میں جب وہ اس سے متضاد معانی کی حامل ہوں۔

بعض صورتوں میں' ریاضیاتی منطق کو چھوڑ کر' میری شائع شدہ تصانیف۔ مکمل طور پر میرے معتقدات یا عمومی نکتہ نظر کی وضاحت سے قاصر رہی ہیں۔ نظریہ علم جس پر میں نے زیادہ توجہ دی ہے اس میں ایک خاص طرح کی لابدی موضوعیت جھلکتی ہے۔ یہاں یہ سوال سر اٹھاتا ہے ''میں'' کیسے جانتا ہوں کہ ''میں کیا چاہتا ہوں'' اس مد میں آغاز لازماً ذاتی تجربے سے ہوتا ہے۔ اس کے مبادیات اور ابتدائی دلائل تمام تر خودنظری کا شکار ہیں۔ میں نے ابھی تک ان ابتدائی مقامات کو طے نہیں کیا۔ اور اسی لئے میرے ہاں موضوعیت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت یوں نہیں ہے۔ میں نہ تو انانیت پسند ہوں اور نہ ہی آورش پسند۔ اگرچہ میرے دلائل ناکافی ہیں' تاہم میں طبیعیاتی کائنات اور ذہنی (نفسیاتی) کائنات کے وجود پر ایمان رکھتا ہوں۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ جو چیز تجربے میں نہ آ سکتی ہو' اس کی طرف استنباط کو رہنمائی کرنی چاہئے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ انانیت کے خوف نے فلسفیوں کو بالعموم اس حقیقت سے اغماض پر مجبور کیا ہے۔ یا تو انہوں نے استنباط کے قوانین کو مجہول حالت میں چھوڑ دیا یا علم بالتجربہ اور علم بالاستنباط میں تمیز اور فرق نظر انداز کر دیا۔ اگر مجھے آئندہ کبھی فرصت ملی کہ کسی سنجیدہ فلسفیانہ مسئلے کی تحقیق کر سکوں تو میں طبیعی میدان میں تجربے سے حاصل ہونے والے نتائج کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ یہ نتائج جواز کے حامل ہو سکتے ہیں' یہ جاننے کی کوشش کروں گا کہ استنباط کے وہ کون سے ایسے قوانین ہیں جو بشرط صحت انہیں جواز بخشتے ہیں۔ اگر ایسے قوانین دریافت ہو بھی جائیں تو کیا وہ قابل قبول ہوں گے یا نہیں۔ اس بات کا دارومدار افتادطبع پر ہے۔ اگر کسی چیز کا جواز افتادطبع پر انحصار نہ کرتا ہو' تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انانیت کو ترک کرتے ہوئے انہیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔

اب میں اس طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ سماجی مسائل کے ضمن میں میں نے کیا فریضہ سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔ میری نشوونما سیاسی ماحول میں ہوئی تھی۔ اور میرے بزرگوں کی خواہش تھی کہ میں سیاست میں حصہ لوں۔ تاہم فلسفہ میں میرا انہاک سیاست کے مقابلہ میں زیادہ تھا۔ اور جب میں نے یہ محسوس کیا کہ میرے ہاں فلسفہ سے طبعی

مناسبیت موجود ہے (میرے ہاں فلسفہ سے طبعی مناسبت موجود ہے) تو میں نے اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ میری دادی اس بات پر ناخوش تھیں۔ انہوں نے جیومیٹری کے مبادیات کے متعلق میری تحقیق کے متعلق یوں اشارہ کیا ''یہ ہے زندگی جو تم گزار رہے ہو'' اور پھر متاسفانہ لہجے میں کہا ''برٹی۔ میں نے سنا ہے تم ایک اور کتاب لکھ رہے ہو۔'' میرے سیاسی مقاصد کو اگرچہ ثانوی حیثیت حاصل تھی تاہم ان میں ایک گونہ شدت بدستور قائم رہی۔ 1895ء میں جب میں برلن میں تھا تو میں نے جرمن سوشل جمہوریت کا مطالعہ کیا۔ جسے میں اس وجہ سے پسند کرتا تھا کہ وہ قیصریت کے خلاف تھی۔ اور ناپسند اس وجہ سے کرتا تھا کہ (اس وقت تک) اس میں مارکسی کٹر پسندی کا غلبہ تھا۔ ایک عرصہ تک سڈنی ویب کے زیراثر میں استعمار پسند بھی رہا۔ حتیٰ کہ میں نے بوئر جنگ کی بھی حمایت کی تھی۔ تاہم 1901ء تک میں نے اس نکتہ نظر سے کلینا'' رجوع کر لیا تھا۔ اس کے بعد سے میں نے انسانی تعلقات میں طاقت کے استعمال کے لئے ایک شدید بیزاری محسوس کی ہے۔ اگرچہ مجھے یہ احساس تھا کہ بعض مواقع پر طاقت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جب جوزف چیمبرلین نے 1903ء میں آزاد تجارت کی مخالفت کی تو میں نے زبانی بھی اور تحریری طور پر بھی اس کی مخالفت کی۔ میرے اختلافات کی وجوہات بین الاقوامیت پر مبنی تھیں۔ میں نے خواتین کے حق رائے دہندگی کے لئے جو تحریک چلی اس میں بھی عملی طور پر شرکت کی۔ 1910ء میں اصول ریاضیات عملاً مکمل ہو چکی تھی۔ اس وقت مجھے پارلیمنٹ میں نشست کے لئے انتخاب میں حصہ لینے کی خواہش تھی۔ اور میں ضرور انتخاب لڑتا۔ لیکن انتخابی کمیٹی میری آزاد خیالی کی بناء پر مجھ سے برگشتہ ہو گئی۔

پہلی جنگ عظیم نے میری ترجیحات کو ایک نئی نہج پر ڈال دیا۔ جنگ اور یہ مسئلہ کہ آئندہ جنگ سے گریز کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔ میرے ذہن پر سوار رہا۔ وہ کتابیں جو میں نے اس موضوع یا اس کے متعلقات پر لکھیں ان کی وجہ سے عوام الناس میں مجھے زیادہ پذیرائی نصیب ہوئی۔ جنگ کے دوران مجھے امید تھی کہ امن کی بنیاد دانشمندانہ رویے کی مظہر ہو گی۔ جس سے آئندہ بڑی جنگوں کا سدباب ہو سکے گا۔ یہ امید معاہدہ ورسیلز نے خاک میں ملا دی۔ میرے بہت سے احباب نے سوویت روس سے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن میں جب 1920ء میں وہاں گیا تو مجھے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جو پسندیدہ یا قابل تعریف

ہو۔ اس کے بعد مجھے چین سے دعوت نامہ موصول ہوا۔ جہاں میں نے تقریباً ایک سال بسر کیا۔ مجھے چینیوں سے محبت ہے۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ مخالفانہ فوجی منصوبہ سازی کا مقابلہ کرتے ہوئے' چینی تہذیب کے بہتر عناصر شکست و ریخت کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ یا تو دوسروں کے محکوم ہو کر رہ جائیں یا پھر دشمنوں کے ہتھکنڈے اپنا لیں۔ تاہم چین سے میں نے ایک سبق حاصل کیا۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو مشرق ہمیشہ ان یورپی باشندوں کو ارزانی کرتا رہا ہے جو چین کا مطالعہ ہمدردانہ رویے سے کرتے ہیں۔ یعنی اب میں نے اپنی سوچ میں وسعت پیدا کر لی۔ اور لمحہ موجود کے شر سے بددل ہونا چھوڑ دیا۔ گزشتہ بیس سال کے عرصے میں بڑھتی ہوئی تاریکیوں کی یلغار کے باوصف اس عادت نے دنیا کو میرے لئے نسبتاً قابل برداشت بنائے رکھا۔

چین سے واپسی کے بعد آنے والے سالوں میں اپنے پہلے دو بچوں کی پیدائش نے میری توجہ ابتدائی تعلیم کے مسائل پر مرکوز کر دی۔ اور کچھ عرصہ تک میں نے اپنی تمام تر توانائیاں اس مسئلے کے لئے وقف کر دیں۔ میرے متعلق عام تاثر یہ ہے کہ میں تدریسی اداروں میں مکمل آزادی کا حامل ہوں۔ لیکن میرے متعلق یہ رائے بھی اسی طرح غلط ہے جس طرح یہ کہنا کہ میں نراج پسند ہوں۔ میرے نزدیک طاقت کا ایک خاص حد تک استعمال حکومتی اداروں کی طرح تعلیمی اداروں کے لئے بھی ضروری ہے۔ تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسے ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ جن سے طاقت کی ضرورت کم سے کمتر ہوتی چلی جائے۔ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ ایک سیاسی دوسرا نجی۔ خوش باش بچے ہوں یا بڑے اصولی طور پر ان کے ہاں منفی رجحانات نسبتاً کم ہوتے ہیں اور اسی لئے ان کے معاملے میں ناخوش رہنے والے لوگوں کی بہ نسبت روک ٹوک کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ تاہم میں یہ نہیں کہتا کہ بچوں کو تربیت / رہنمائی سے محروم کر کے خوش رکھا جا سکتا ہے۔ نہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ سماجی ذمہ داری کا احساس تن آسانی کے ذریعے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بچوں میں نظم و ضبط کا مسئلہ بعض دوسرے مسائل کی طرح تناسب کا مسئلہ ہے۔ بہت زیادہ ناخوشی اور جبلی افسردگی دنیا کے خلاف غم و غصہ کا شدید ردعمل پیدا کر دیتی ہے جو ایک پیچیدہ عمل کے ذریعے ظلم اور تشدد پر منتج ہوتی ہے۔ نفسیاتی اور سماجی مسائل نے پہلے پہل جنگ کے دوران 1914-18ء میں مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں خاص طور پر اس امر سے بہت متاثر ہوا کہ

آغاز میں بہت سے لوگ جنگ کو پسند کرنے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کا باعث بہت سی سماجی برائیاں تھیں۔ جن میں سے بعض کا تعلق تعلیم و تدریس کے شعبے سے تھا۔ اگرچہ والدین اپنے اپنے بچوں کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں تاہم مجموعی حیثیت سے تعلیمی اصلاحات کا دارومدار حکومت پر ہے۔ اس مقصد کے لئے پیشرو سماجی اور اقتصادی اصلاحات کا نفاذ ضروری ہے۔ دنیا اس اثناء میں تیزی کے ساتھ جنگ اور آمریت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ عملی سطح پر میں کچھ کرنے کا اہل نہیں تھا۔ چنانچہ نظریات کے حوالے سے میں اور بھی شدومد کے ساتھ فلسفے اور تاریخ میں مگن ہو گیا۔

ریاضی اور فلسفہ کو چھوڑ کر تاریخ میں میری دلچسپی ہمیشہ دوسرے مضامین کی بہ نسبت زیادہ رہی ہے۔ میں تاریخی ارتقاء کی کسی منصوبہ سازی کو ہیگل یا مارکس کی طرح قبول نہیں کرتا۔ تاہم عمومی رجحانات کا مطالعہ روا ہے۔ کیونکہ یہ مطالعہ زمانہ حال کے حوالے سے بھی اہم ثابت ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے رجحانات کو سمجھنے میں 1814ء تا 1819ء کی آزاد خیالی کے مطالعے نے میری بہت مدد کی۔ آزاد خیالی کے دو رجحانات یعنی عقلی اور رومانی جن کی نمائندگی بینتھم اور روسو کرتے ہیں' ان میں کبھی تعاون اور کبھی تصادم کے متبادل تعلقات اس وقت سے بدستور کارفرما ہیں۔

سماجی حالات سے فلسفے کے تعلق کو نظری فلسفی بالعموم نظرانداز کر دیتے ہیں۔ مارکسی، فلسفے کو صرف ایک نتیجہ کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ اس کو سبب ماننے سے منکر ہیں۔ تاہم ظاہر ہے کہ فلسفے کا ہر اہم مکتب دونوں حیثیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو افلاطون کا ظہور پیلوپینشین جنگ میں سپارٹا کی فتح کا ایک نتیجہ تھا اور دوسری طرف جزوی طور پر عیسوی الہیات کا سبب بھی تھا۔ اگر اس کے صرف اول الذکر پہلو کو مدنظر رکھا جائے تو پھر قرون وسطیٰ کے چرچ کا ارتقاء ناقابل فہم ہو جاتا ہے۔ میں ان دنوں مغربی فلسفے کی تاریخ مرتب کر رہا ہوں۔ تھیلز سے زمانہ حال تک۔ اس میں میں نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر اہم فلسفیانہ نظام کا سماجی حالات کے سبب اور نتیجہ کے طور پر یکساں جائزہ لیا جائے۔

میری ذہنی تگ و تاز بعض اعتبارات سے مایوس کن رہی ہے۔ جوانی میں مجھے فلسفے میں مذہبی ایقان کی تلاش رہی۔ ہیگل سے رجوع کر لینے کے بعد بھی افلاطون کی ابدی کائنات میں کچھ ماورائے انسانیت کوائف مجھے احترام کا تقاضا کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

ریاضی کا بھی میرے دل میں بہت احترام تھا۔ میں اس وقت صدمے کی ایک حالت سے دوچار ہوا تھا جب وٹگنسٹائن کے زیر اثر میں نے یہ نظریہ قبول کیا کہ ریاضی تو تکرار بالمعنی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ ان جذبات کا جواز تلاش کرسکوں جو انسانی زندگی سے ماورا بعض اشیاء سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اور بجا طور پر ہیبت کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں میرے پیش نظر اکثر ظواہر رہے ہیں۔ مثلاً تاروں بھرا آسمان' پتھریلے ساحلوں پر طوفانی لہروں کی یلغار۔ اور ایک حد تک زمان و مکان میں سائنسی کائنات کی وسعت۔ اور اس کے مقابلے میں انسانی زندگی کی بے بضاعتی۔ میرے پیش نظر۔ مجرد صداقت کا وہ پُرشکوہ محل بھی رہا ہے جو ریاضی کی طرح اس صداقت کو جیسے کہ وہ معروضی طور پر موجود ہے نظرانداز کرتا ہے۔ وہ لوگ جو انسان دوستی کو مذہب کا درجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو انسان سے برتر کسی مخلوق کا تصور نہیں کر سکتے۔ جذباتی سطح پر مجھے مطمئن نہیں کر سکتے تاہم میں دنیا میں جیسی کہ وہ ہے کسی چیز کو انسانی وجود سے برتر حیثیت دینے پر بھی آمادہ نہیں ہوسکتا۔ بالخصوص جہاں تک حیوانی زندگی کا تعلق ہے۔ ستاروں بھرے آسمان میں کوئی خاص بات نہیں البتہ انسانی محرکات پر وہ جس طرح اثر انداز ہوتا ہے وہ اہم ہے۔ کائنات کو اس کی وسعت کی وجہ سے خراج عقیدت پیش کرنا عبث ہے۔ اور غلامانہ ذہنیت کا عکاس غیر ذاتی اور ماورائے انسانیت حقیقت محض فریب نظر ہے۔ چنانچہ میری عقل تو انسان دوستوں کے ساتھ ہے۔ تاہم میرے جذبات اس کے خلاف شدت کے ساتھ بغاوت پر مائل ہیں۔ اس اعتبار سے فلسفہ سے حاصل ہونے والی طمانیت میرے نصیبوں میں نہیں۔

اس کے برعکس خالصتاً ذہنی سطح پر فلسفے سے میں نے اتنی ہی طمانیت حاصل کی ہے جتنی بربنائے معقولیت ممکن ہوسکتی تھی۔ بہت سے معاملات جو ابتداء میں میرے لئے پریشان کن تھے، کہ ان کے متعلق جو کچھ کہا سنا گیا تھا وہ غیر واضح تھا، پریشان خیالی کا طومار تھا اب ان کو ایک منظّم طریق کار سے سلجھایا جا سکتا ہے۔ جس سے وہ ارتقائی مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں جو سائنس میں رائج ہیں۔ جہاں یقینی علم نا قابل حصول ہو۔ وہاں بعض اوقات یہ ثابت کرنا ممکن ہوتا ہے کہ فی الواقع اس کا حصول ممکن نہیں۔ اور اس طرح کے قطعی مقدمات وضع کئے جا سکتے ہیں۔ جو موجودہ ثبوت سے ہم آہنگ ہوں۔ وہ فلسفی جنہوں نے منطقی تجزیئے کے اصول اپنائے ہیں وہ آپس میں قدیم بے مقصد مناظرے کی بجائے اب ہمدردانہ بحث و

تمحیص سے ایسے نتائج تک پہنچ سکتے ہیں جو فریقین کے لئے یکساں قابل قبول ہوں۔ یہ چیز میری زندگی میں ایک جدت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا بانی مبانی فریجے Frege تھا۔ تاہم وہ اپنی آخری عمر تک تنہائی پسند رہا۔ استدلالی طریق کار کی اس وسعت پذیری کو میں بہت بے حد قابل قدر سمجھتا ہوں۔ جنگ کے ہنگاموں اور نئے توہمات کی عقوبت کے صدمے سے فلسفیانہ معقولیت کا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تاہم یہ امید کی جا سکتی ہے یہ کلیتاً ملیامیٹ نہیں ہو جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ آئندہ چند صدیاں اس پر بھاری ہو سکتی ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو بحیثیت فلسفی میری زندگی بہجت اندوز رہی ہے۔

☆☆☆

مذہب آزادگان

میفیسٹوفلیس(Mephistophelis) نے ڈاکٹر فاؤسٹس(Faustus) کو اس کے مطالعہ کے کمرے میں تخلیق کائنات کا قصہ یوں سنایا تھا۔

فرشتوں کے طائفوں کی ختم نہ ہونے والی حمد وثناء کسی قدر بے لطف ہو چلی تھی۔ خدا تعالیٰ نے ان کو جو ابدی طمانیت بخشی تھی، اس کے بدلے میں اگر وہ اس کی تقدیس کرتے تھے تو یہ گویا اس کا حق ادا کرتے تھے۔ مزا تو جب تھا کہ حمد وثناء جذبہ تشکر کا نتیجہ نہ ہوتی۔ حمد بیان کرتی تو وہ مخلوق جو مصائب کا شکار تھی۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ کے دل میں آئی کہ اب ایک عظیم تر راس رچانی چاہیئے۔

بے شمار صدیوں سے گرم سدیم خلاء میں بے مقصد سرگرم خروش تھا۔ بالآخر اس میں ایک ترتیب ظہور پذیر ہوئی۔ مرکزی ٹھوس مادے سے ستارے جھڑنے لگے۔ پھر ستارے ٹھنڈے ہوتے گئے تو ابلتے ہوئے سمندر اور جلتے ہوئے پہاڑ نمودار ہونے لگے۔ دھواں دار بادلوں سے تپتی ہوئی بوچھاڑ نے ان کے قشر کو ایک آتشی چادر سے ڈھانپ دیا۔ پھر زندگی کے پہلے جرثومے نے گہرے سمندروں کے بطن میں ظہور کیا۔ اور حیات پرور درجہ حرارت کے فیض سے تناور درختوں کے جنگل اور فرن کے جھاڑ جھنکار نم آلود مادے سے وجود میں آئے۔ سمندروں میں عجیب الخلقت مخلوق نے جنم لیا اور باہمی پیکار میں ایک دوسرے کو فنا کے گھاٹ اتارتے رہے۔ انہی عفریتوں کے غول میں سے جب یہ تخلیق کا کھیل آگے بڑھا تو انسان نمو پذیر ہوا۔ جسے فکر کی قوت عطا کی گئی تھی۔ جو خیر وشر کے علم سے بہرور تھا۔ اور جس کے اندر عبودیت کا ایک بے پناہ جذبہ موجزن تھا۔ اور انسان نے دیکھا کہ بے ہنگم مخلوق اس جہان جنوں میں پے در پے فنا پذیر تھی۔ اور اس کوشش میں تھی کہ موت کے بے

رحم ہاتھ کے اس تک پہنچنے سے پہلے زندگی کے چند مختصر لمحے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لے۔ اور پھر انسان نے کہا کہ ''یہ ایک سربستہ راز ہے۔ کاش کہ ہم اسے پا سکیں۔ کیونکہ یہ راز خیر ہے۔ اور ہمیں چاہئے کہ اس کی پرستش کریں کیونکہ ظواہر کی کائنات میں تو کوئی ایسی شے نہیں جو پرستش کے لائق ہو' اور انسان کشمکش سے دستبردار ہوا۔ اور اس نے جان لیا کہ خدا چاہتا ہے کہ یہ انتشار اور بدنظمی انسان کی کوشش سے آہنگ اور نظم و ضبط میں ڈھل جائے۔ پھر جب اس نے ان جبلتوں کی پیروی کی جو خدا نے اسے اس کے وحشی آباؤ اجداد کی وراثت کے طور پر تفویض کی تھیں تو اس نے انہیں ''گناہ'' کا نام دیا۔ اور خدا سے عفو کا طلبگار ہوا۔ تاہم اسے شک تھا کہ از روئے انصاف اس کا گناہ شاید قابل عفو نہ ہو۔ چنانچہ اس نے ایک الوہی منہاج کو دریافت کیا جس کے ذریعہ عتاب الٰہی ٹل سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ حال بدی سے مملو ہے اس نے اسے خراب تر کر دیا تاکہ بہتر مستقبل کا ڈول ڈالا جا سکے۔ چنانچہ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسے ہمت بخشی کہ وہ ان لذتوں سے بھی ہاتھ کھینچ لے جو اس کی دسترس میں ہیں۔ اس پر خدا خوش ہوا۔ کہ انسان قناعت اور پرستش میں درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ آسمانوں میں ایک اور سورج نمودار ہوا۔ جو انسان کے سورج سے ٹکرایا۔ اور ساری مخلوق پھر سدیم میں لوٹ گئی۔ اور اس نے اپنے آپ سے کہا ''ہاں یہ تماشا بھی خوب رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سب دوبارہ وقوع پذیر ہو۔''

اور یہی اس کائنات کا خاکہ ہے' جو سائنس ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ البتہ یہ خاکہ اور بھی بے مقصد اور تہی از معنی ہے۔ تاہم یہی وہ کائنات ہے۔ جس میں اگر ممکن ہو تو ہمارے آدرش کو مستقبل میں تشکیل پذیر ہونا ہے۔ انسان ایسے اسباب کی پیداوار ہے جو اس انجام سے بے خبر تھے جس کی طرف وہ بڑھ رہے تھے۔ انسان کی آفرینش نشوونما، امید و بیم' علائق اور معتقدات سب کے سب ایٹموں کے ایک اتفاقی اجتماعی کا نتیجہ ہیں۔ کوئی سرگرمی، کوئی ولولہ، کسی خیال یا جذبے کی شدت گور کنارے سے دوسری طرف انسانی تجربہ کے تحفظ کی ضامن نہیں بن سکتی۔ انسان کی عمروں کی کاوشیں' تمام تر جذبہ عبودیت' تمام امنگیں' اس کی فطانت کی چمک دمک کا مقدر یہی ہے کہ وہ نظام شمسی کے وسیع جہان فنا میں ناپید ہو جائے۔ انسانی فتوحات کے عظیم محل اس قضائی مبرم سے دوچار ہیں کہ وہ ایک فنا پذیر کائنات کے ملبے میں دب کر رہ جائیں۔ ان تمام امور میں قیل و قال کی گنجائش ہے تاہم

حقیقت یہی ہے کہ کوئی فلسفہ جو ان سے صرف نظر کرے قابل قبول نہیں ہوسکتا ہے۔ انہی صداقتوں کی حدود کے اندر، اور ناگزیریاس، کی مضبوط بنیاد پر ہی آئندہ کے ئے روح کا مسکن تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

اس اجنبی اور بے رحم دنیا میں انسان جیسی بے بس مخلوق اپنے عزائم کو کیونکر برقرار رکھ سکتی ہے۔ یہ ایک عجیب رمز ہے کہ فطرت بے بصر قادر مطلق ہے۔ وہ اپنے غیر جانبدار منصوبوں کی جلد از جلد تکمیل کے دوران ایک ایسی مخلوق کو جنم دے بیٹھی ہے جو اگرچہ اس کے رحم و کرم پر ہے۔ تاہم اسے بصارت بھی عطا ہوئی ہے۔ اسے خیر و شر کا علم دیا گیا ہے۔ اور وہ اپنی سوچ سے عاری مادر تخلیق کے کارنامے کی پرکھ پر بھی قادر ہے۔ موت کے باوجود۔ اور اپنے خالق کی عائد کردہ پابندیوں کے باوصف انسان اپنی مختصر زندگی میں جانچ پڑتال، نقد و جرح، حصول علم اور اپنے تخیل کے بل بوتے پر تخلیق پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ اپنی جانی پہچانی دنیا میں صرف اسی کو یہ تصرفات حاصل ہیں۔ اور یوں اسے اپنی خارجی زندگی پر حاوی مزاحم قوتوں پر تفوق حاصل ہے۔

وحشی بھی ہماری ہی طرح فطرت کی طاقتوں کے مقابلے میں اپنی ناتوانی سے پیدا ہونے والے جبر کو محسوس کرتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ خود بھی قوت کا پرستار ہے اس لئے اپنے دیوتاؤں کے سامنے عبودیت کا دم بھرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ پرستش کے حق دار ہیں یا نہیں۔ کینہ جو دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے ظلم، بربریت ذلت اور انسانی جانوں کی قربانی کی داستان بڑی دلسوز اور وحشت ناک ہے، خوفزدہ پجاری یہ سمجھتے ہیں کہ جب ان پر عنایات کی بارش ہوتی ہے تو پھر دیوتاؤں کی خون آشام پیاس کو بجھانا بھی ضروری ٹھہرتا ہے۔ اس کے بعد ان سے کوئی اور تقاضا نہیں کیا جائے گا۔ مولاک (Moloch) یا خون آشام دیوتا کا مذہب (جیسا کہ اس قسم کے سب مذاہب کو کہنا چاہئے) دراصل غلامانہ ذہنیت کی خوفزدگی کی علامت ہے۔ اس کے باعث غلام اپنے دل میں بھی کبھی یہ خیال نہیں لا سکتے کہ ان کے آقا کسی ستائش کے حق دار نہیں۔ جب تک نصیب العین کی آزادی کا اقرار نہیں کیا جاتا اس وقت تک قوت کی کھلے بندوں پرستش ہوتی رہے گی۔ اس کی ایذاء رسانی کی ہوس کے باوجود اسے بے حد عزت کا حق دار سمجھا جائے گا۔

تاہم اخلاقی حاسہ کی جرأت آموزی کے ساتھ ساتھ، بہتر دنیا کی ضرورت کا احساس بھی

بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ جان لیا جاتا ہے کہ پرستش اگر ناگزیر ہے بھی تو اس کے حق دار کچھ اور طرح کے خدا ہیں نہ کہ وہ جنہیں وحشی نے تخلیق کیا تھا۔ کچھ لوگ جو معیاری آدرشی کو قبول نہیں کرتے انہیں اب بھی اصرار ہے کہ قوت محض لائق پرستش ہے۔ خدا تعالیٰ نے یونسؑ کو بگولے کے اندر سے جو جواب دیا تھا' اس کی روح بھی یہی ہے۔ یعنی یہ کہ خدا کی قوت و طاقت اور اس کے علم کا تو برسرِ عام چرچا کیا جاتا ہے لیکن رحمت الٰہی کے متعلق بھولے سے اشارہ بھی نہیں کیا جا جاتا۔ فی زمانہ جو لوگ اپنی اخلاقیات کی بنیاد جہد للبقاء کو قرار دیتے ہیں' وہ بھی اسی طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ بقاء لازماً ان کا حصہ ہے جو سب سے بہتر ہیں۔ (بقائے اصلح) اس کے برعکس کچھ لوگ جن کا اخلاقی حاسہ اس جواب کو گوارا نہیں کرتا تو وہ دوسرا رستہ اختیار کرتے ہیں جس کے اب ہم کم و بیش مذہبی رویئے کے طور پر عادی ہو چکے ہیں۔ وہ یہ کہ کسی پُراسرار طریقے سے حقیقت اشیاء دراصل معیاری آدرشی حقیقت سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ انسان ایک ایسا خدا خلق کر لیتا ہے جو ہمہ قوت اور ہمہ خیر ہے۔ یعنی ''جو ہے'' اور ''جو ہونا چاہئے'' کی سری وحدت۔

تاہم ہمارے سامنے کی کائنات/دنیا سرتا سر خیر بھی نہیں ہے۔ اور جب ہم اپنی آراء کو اس کے حوالے سے متعین کرتے ہیں تو یہ بھی ایک گونہ غلامانہ ذہنیت کا مظہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی سوچوں کو اس ذہنیت سے آزادی دلانا ضروری ہے۔ ہر معاملے میں انسان کی برتری کے تصور کو بڑھاوا دینا' یقیناً اس لحاظ سے بہتر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے انسان کو غیر انسانی قوتوں کے جبر و استبداد سے آزاد ہونا چاہئے۔ جب ہم یہ جان لیتے ہیں کہ قوت بالعموم مشتمل بہ شر ہے۔ اور یہ کہ انسان خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت کے باوصف ایک ایسی دنیا میں ایک بے بس ذرے کی حیثیت رکھتا ہے جو اس تمیز سے نا آشنا ہے تو گویا فیصلہ پھر ہمیں پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ ہمیں قوت کی پرستش کرنی چاہئے یا خیر کی کیا ہمارا خدا موجود بالذات ہے۔ اور خالق شر ہے یا وہ صرف ہمارے ضمیر (اخلاقی حاسہ) کی تخلیق ہے۔

اس سوال کا جواب بے حد اہمیت کا حامل ہے اور دراصل ہماری اخلاقیات کو متاثر کرتا ہے۔ قوت کی پرستش۔ جس کا کارلائل' نٹشے اور جنگجویانہ رویوں نے ہمیں عادی بنا دیا ہے۔ دراصل ایک مخالفانہ قوتوں سے مملو کائنات میں ہمارے نصب العین کی شکست کا اعتراف ہے۔ یہ بذاتہ شر کے سامنے جھک جانے کے مترادف ہے' خون آشام دیوتاؤں کے لئے یہ

ہمارے بہترین سرمائے کی قربانی ہے۔ بالفرض قوت کا احترام ناگزیر ہے تو پھر ہمیں اس قوت کا احترام کرنا چاہئے جو حقیقت کی غلط تعبیر کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ غلط تعبیر جو یہ نہیں مانتی ہے کہ حقائق شر بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ اقرار کر لینا چاہئے کہ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کسی دوسری نہج پر ہوتیں تو بہتر ہوتا۔ اور یہ کہ وہ نصب العین جو ہمارا مقصود ہیں اور جنہیں ہمارے مقصود ہونا چاہئے، مادی دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتے یہ دراصل ہمارے خیالات کی انفعالیت ہے نہ کہ جذبات کی۔ رواقیت کی آزاد روی جو خردمندی کی جان ہے ضبط نفس کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ خیالات کی انفعالیت کا۔ ضبط نفس سے تیاگ/ قناعت کی صفت نمو پذیر ہوتی ہے۔ خیالات کی آزادی سے، فن و فلسفہ اور جمال کے تصورات کی دنیا وجود میں آتی ہے۔ جس سے ہم کائنات کی آدھی مزاحمت کو تسخیر کر لیتے ہیں۔ حسن و خوبی کا جلوہ تو تبھی ظہور کرتا ہے جب ہمیں فکر کی آزادی حاصل ہو۔ آزادی صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو زندگی سے ان ذاتی مفاد کی بھیک نہیں مانگتے جو امتداد وقت کی زد میں ہوتے ہیں۔

اگرچہ تیاگ/قناعت کا التزام، وجود شر کا ایک ثبوت ہے۔ تاہم عیسائیت نے اس کی جو تعلیم دی ہے وہ پرومیتھیس کے نظریہ بغاوت سے کہیں زیادہ دانشمندی کی حامل ہے۔ اس بات کا اقرار کر لینا چاہئے کہ جن چیزوں کی ہم تمنا کرتے ہیں ان میں اگرچہ کچھ ناممکن الحصول ہوتی ہیں۔ تاہم ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اگرچہ ان کی تمنا میں وہی اشتیاق پایا جاتا ہے تاہم وہ کسی پاکیزہ مقصد/نصب العین کا حصہ نہیں ہوتیں۔ یہ خیال کہ جس کا ترک کرنا ضروری ہو ہو لازماً شر ہوتا ہے بعض اوقات غلط بھی ہوتا ہے۔ تاہم اتنا غلط بھی نہیں ہوتا جتنا بے محابا جذبات فرض کر لیتے ہیں۔ مذہب کے اس رویے نے جو اس بات پر تلا رہتا ہے، کہ ایسے وجوہات فراہم کر سکے، جو تیاگ کو ہر حال مین درست ثابت کریں ہمیں وہ ذرائع فراہم کئے ہیں جو بعض تلخ حقائق کی دریافت سے تہذیب نفس کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

تیاگ میں اس کے علاوہ بھی ایک خوبی کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی یہ کہ حقیقی خوبیاں بھی جب ناقابل حصول ہوں تو ان کے لے شدید جذبے کو پرورش نہیں کرنا چاہئے۔ ہر انسان کو جلد یا بدیر کلی ترک کی صلاحیت نصیب ہوتی ہے۔ جوانی میں کوئی چیز ناممکن الحصول نظر نہیں

آتی۔کوئی ایسی چیز جو خیر بھی ہو اور جسے پوری شدت سے طلب کیا جائے لیکن بااین ہمہ وہ ناممکنات میں شامل ہو۔ جوانی میں یہ بات قابل قبول نہیں ہوتی۔ تاہم موت' بیماری' غربت، یا فرض کی پکار کے ہوتے صداقت' حسن و خوبی اور تکمیل ذات کے ان آدرشوں کی حفاظت کرنی چاہئے جن کے حصول کی دو روزہ زندگی ہمیں مہلت نہیں دیتی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا شعور سے عاری کائنات میں کوئی وجود نہیں۔ (کائنات جن کا اثبات نہیں کرتی) اگر قوت فی الاصل شر ہے جیسا کہ وہ ہے تو پھر ہمیں صمیم قلب سے اس کی مذمت کرنی چاہئے۔ انسان کی حقیقی آزادی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ ہم صرف اس خدا کی پرستش کے لئے آزاد ہوں جو ہمارے حب خیر کے جذبے کا مظہر ہے۔ اور صرف اس فردوس کے متلاشی ہوں جو ہمارے بہترین لمحات کی بصیرت کی محرک ہو۔ عملی طور پر اور اپنی خواہشات کی حد تک تو خارجی دنیا کا جبر مسلسل ہم پر حاوی ہے۔ لیکن اپنے خیالات میں' اپنی امنگوں اور آرزوؤں میں ہم آزاد ہیں۔ اپنے ہم نفسوں سے بھی آزاد ہیں۔ اور اس بے مایہ سیارے کے جبر سے بھی آزاد ہیں جس پر ہمارے ناتواں جسم گھسٹتے رہتے ہیں۔ اور جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تو کم از کم موت کے جبر سے بھی آزاد ہیں۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ ایمان کی قوت ہی وہ قوت ہے جو ہمیشہ ہمیں خیر کے روبرو رکھتی ہے۔ اور اسی کے سہارے ہم میدان کارزار میں اس طرح اتریں کہ روئے خیر ہمیشہ ہمارے سامنے ہو۔

حقیقت اور نصب العین میں جب تضاد بین ہو جاتا ہے تو خداؤں کے خلاف بغاوت اور نفرت کا ایک شدید جذبہ' آزادی کی تائید و اثبات کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ پرومیتھیس نے جس ثابت قدمی کے ساتھ کائنات کی معاندانہ قوتوں کے خلاف دفاع کیا تھا، اس کا اتباع ان لوگوں کو شیوہ ہے جو تقدیر مبرم کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تاکہ اس کا شر ہمیشہ پیش نظر رہے۔ اس کے خلاف نفرت کا جذبہ سرد نہ ہونے پائے۔ اور کینہ توز قوت جو آلام و مصائب ایجاد کر سکتی ہے' ان سے منہ نہ موڑا جائے۔ تاہم یہ برہمی بھی ایک طرح کی پابندی ہے۔ کیونکہ اس کے زیر اثر ہم مسلسل دنیائے شر کے تصورات میں الجھے رہتے ہیں۔ جذبات کی اس شدت میں جس سے بغاوت جنم لیتی ہے' ایک طرح کی انانیت یا ادعا پسندی پائی جاتی ہے جس سے خردمند ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ دنیا محض ایک فرد کے لئے نہیں بنائی گئی۔ چنانچہ

جس چیز کی ہمیں طلب ہو وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو' تقدیر چاہے تو اسے بہرحال ہمارے لئے حرام کر دے۔ یہی تو جرات اور بہادری ہے کہ جب حرماں نصیبی ڈیرے ڈال لے ہم اسے اپنی تمناؤں کے خون کا ماتم کئے بغیر نہ گزریں۔ اور بے فائدہ احساس زیاں سے باہر نکل آئیں۔ اس حد تک جبر وقوت کا اقرار نہ صرف یہ کہ صحیح اور مبنی برانصاف ہے بلکہ صحیح معنوں میں خردمندی ہے۔

تاہم انفعالی ترک بھی سراسر خردمندی نہیں۔ کیونکہ صرف اور صرف ترک سے ہم اپنے مقاصد کی پرستش کا مندر تعمیر نہیں کر سکتے۔ اس معبد کے منڈلاتے ہوئے سائے' تخیل کی دنیا کو آباد کرتے ہیں۔ موسیقی' فن تعمیر' کشمکش سے پاک اندیشہ' اور شاعری کی رنگین شاموں کا جادو' جہاں حسن جلوہ گر ہوتا ہے' غم کے تاثرات سے پاک' انقلابات کے خوف سے دور' حقیقی دنیا کی ناکامیوں اور بے کیفی سے آزاد' انہیں چیزوں کے تصورات کے پردے میں فردوس بریں کے نقش ہمارے دلوں میں ابھرتے ہیں۔ انہی سے ہمیں وہ کسوٹی ہاتھ آتی ہے جو اپنے ماحول کا معیار بنتی ہے۔ انہی سے ہمیں وہ ولولہ حاصل ہوتا ہے جس سے ہم ہر اس چیز کو اپنی خواہش کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں جو بظاہر ایک موہوم جنت کی تعمیر میں کسی مصرف کی نظر نہیں آتی۔

ان نفوس قدسیہ کے علاوہ جو پیدا ہی معصوم ہوتے ہیں' اس موہوم جنت میں داخلے سے پہلے ایک تاریک غار میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ حسرت و یاس اس غار کا دروازہ ہیں۔ اس کے فرش بھولی بسری تمناؤں کے مزاروں کے کتبوں سے بنائے گئے ہیں۔ یہاں نفس کو مارنا پڑتا ہے۔ یہ مقتل ہے شوق فراواں سے پیدا ہونے والی ہر خواہش اور لالچ کا۔ تقدیر کے چنگل سے روح صرف اسی حقیقت کو جان کر نجات حاصل کر سکتی ہے کہ اس غار سے باہر نکلنے کا دروازہ تیاگ اور ترک ہے۔ جہاں سے پھر عقل وخرد کے روشن دن کی طرف راہ نکلتی ہے۔ اس روشنی میں ایک نئی بصیرت' ایک نئی سرخوشی اور ایک نیا گداز پیدا ہوتے ہیں جو زائر کے دل کو طمانیت سے بھر دیتے ہیں۔

جب ہم بغاوت کے تلخ جذبے سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو تقدیر کے خارجی قوانین کے حوالے کرنے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں اور یہ جان لیتے ہیں کہ کوئی غیر انسانی چیز قابل پرستش نہیں' تو پھر ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ بالآخر اس اندھی بہری کائنات کو اس طرح بدل

سکیں، اسے ایک نئی ترتیب عطا کر سکیں کہ وہ ہمارے تخیل کے سانچوں میں ڈھل کر پرانے مٹی کے بت کو ایک نیا چمکتا ہوا سنہری روپ عطا کر دے۔ دنیا کے مختلف النوع حقائق درختوں پہاڑوں اور بادلوں کے نظارے، انسانی زندگی کے واقعات، حتیٰ کہ موت کے بے اماں قہر میں بھی تخلیقی تخیل کی بصیرت، اس حسن کا نظارہ کر سکتی ہے جسے خود اس کے تصورات نے ہی پہلے پہلے جنم دیا تھا۔ اس طرح ذہن فطرت کی بے بصر طاقتوں پر تصرف حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اسباب جن سے اسے پالا پڑتا ہے، جتنے زیادہ شرانگیز ہوں، جتنی زیادہ مایوس کن وحشی خواہشات سے اس کا سابقہ ہو۔ اس کا کارنامہ بھی اتنا ہی عظیم تر ہوتا ہے کہ وہ کس طرح سربستہ چٹانوں کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے چھپے ہوئے خزانے اگل دیں۔ اس کی فتح جتنی زیادہ مخالفانہ قوتوں کو زیر کرتی ہے اتنی ہی زیادہ شاندار ہوتی ہے۔ فن میں حزنیہ کو فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ اپنے قلعے دشمن کی مملکت کے عین وسط میں اس کے بلند پہاڑوں پر استوار کرتا ہے۔ اور ان قلعوں کے ناقابل تسخیر دیدبانوں سے دشمن کے فوجی دستے، اس کا اسلحہ خانہ، اس کے مورچے اور قلعے سب واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی فصیلوں کے اندر زندگی کی لہر رواں دواں رہتی ہے۔ موت، دکھ درد اور یاس و نومیدی کے لشکر اور ظالم و جابر تقدیر کے فرمانبردار فوج دار اس ناقابل تسخیر بستی کے باشندوں کو حسن و جمال کے تازہ جلووں سے محظوظ کرتے ہیں۔ مبارک ہیں یہ قلعے زندہ باد ان شاندار عمارتوں کے باسی! لائق تعظیم ہیں وہ بہادر سپاہی جنہوں نے طویل جنگوں کے درمیان ہمارے لئے آزادی کا بیش بہا ورثہ محفوظ رکھا ہے اور مغلوب نہ ہونے والوں کے گھروں کو حملہ آوروں کے ناپاک ہاتھوں بے حرمت ہونے سے بچائے رکھا ہے۔

حزنیہ ایک ایسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو کسی حد تک واضح صورتوں میں زندگی میں ہمیشہ سے اور ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ موت کے جملہ مظاہر میں، ناقابل برداشت اذیت کا سامنا کرنے میں، اور گزرے ہوئے زمانے کی رجعت ناپذیری میں ایک تقدس ہے، ایک ہیبت ہے۔ وسعت و گہرائی کا احساس ہے اور زندگی کے کبھی ختم نہ ہونے والے تحیر میں یوں نظر آتا ہے جیسے درد کے ایک عجیب پیوند سے، مصیبت زدگان دنیا سے غموں کے بندھن کے ذریعے جکڑے ہوئے ہیں۔ ان بصیرت افروز لمحوں میں وقتی خواہشات کی بے صبری حقیر مقاصد کے لئے تگ و دو، پیش پا افتادہ ہیچ چیزوں کے لئے فکر و تردد، جو بظاہر روز مرد

زندگی کا اثاثہ ہیں' سب کچھ مٹ جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک تاریک سمندر پھیلا ہوا ہے، جس کی موجوں کی جولانیوں میں ہمیں بھی چند لمحوں کے لئے ڈوبنے ابھرنے کی مختصر مہلت ارزانی ہوئی ہے۔ اس میں انسانی تعلقات کی جھلمل کرتی روشنیوں سے مزین ایک بجرا ہے۔ پھر باہر پھیلی ہوئی عظیم رات کی ظلمتوں میں سے ایک برفانی تھپیڑا ابھر کر ہماری اس پناہ گاہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ معاندانہ قوتوں کے درمیان انسان کی بے اماں تنہائی' فرد واحد کی روح کو گھیر لیتی ہے۔ اور پھر اسے تن تنہا اپنی رہی سہی قوت مدافعت کے سہارے' پوری کائنات کے بوجھ کو جھیلنا ہوتا ہے۔ جو اس کی امید و بیم سے یکسر بے پرواہ ہوتا ہے۔ تاریک قوتوں کے خلاف اس مہم میں فتح و کامرانی ہی وہ اصطباغ ہے جو ہمیں اکابر کی شاندار محبت کا اہل بنا دیتا ہے۔ انسانی زندگی کے ہمہ نوع فاتح جمال سے روشناسی کا یہی ایک طریقہ ہے۔ خارجی دنیا سے روح کے اس ہولناک تصادم سے بے نیازی' خردمندی اور نیکی جنم لیتی ہیں۔ جو ایک نئی زندگی کے آغاز کی بشارت دیتی ہیں۔ موت بے ثباتی ماضی کی بازیابی کا انقطاع' کائنات کی اندھی تیز رفتاری کے مقابلے میں انسان کی بے بسی پے در پے ہزیمتیں' ان ناقابل مقادمت قوتوں کو (جن کا انسان صید زبوں نظر آتا ہے) اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار لینا' ان کا احساس' ان کا شعور' ان پر تصرف حاصل کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔

ماضی کی سحر انگیز قوت کا سبب یہی ہے۔ ماضی کی بے حس و حرکت اور خاموش تصویریں' جاتے ہوئے موسم خزاں کی جادو بھری پاکیزگی کی طرح ہیں۔ جب پتے اگرچہ ہوا کی ایک ضعیف لرزش سے گر سکتے ہیں' لیکن بایں ہمہ آسمان کے تنے ہوئے بدرنگ پردے کے سامنے' ایک سنہری آب و تاب سے چمکتے ہیں۔ ماضی نہ بدلتا ہے اور نہ خروش آمادہ ہے۔ یوں نظر آتا ہے جیسے ڈنکن (Duncan) کی طرح وہ زندگی کے بخار کے بحران کے بعد محوخواب ہے۔ شوق فراواں کی گرفت اور ہیچ پوچ تغیرات' سب یکسر محو ہو جاتے ہیں۔ البتہ وہ چیزیں جو خوبصورت اور پائیدار ہوتی ہیں' وہ ماضی کے افق پر ستاروں کی طرح چمکتی رہتی ہیں۔ ماضی کا حسن و جمال ہیچ میرز روحوں کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ لیکن وہ روحیں جو اپنی تقدیر پر حاوی ہوں ان کے لئے یہ مذہب کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

فطرت کی طاقتوں کے مقابلے میں بظاہر انسانی زندگی حقیر نظر آتی ہے۔ غلامانہ ذہنیت

کے لئے وقت' تقدیر اور موت کی پرستش کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ وہ اس کی ذات کے جملہ امکانات سے برتر ہیں۔ اور وہ صرف انہیں چیزوں کا تصور کر سکتا ہے۔ جنہیں یہ فنا کر دیتی ہیں۔ بے شک وہ بہت قوی ہیں۔ لیکن ان کے متعلق پروقار سوچ اور ان کے غیر جذباتی شکوہ کا احساس ان سے بھی عظیم تر ہے۔ اسی طرح فکر اور احساس سے ہم آزادی حاصل کرتے ہیں۔ ہم ان ناگزیر طاقتوں کے سامنے روایتی عبودیت کے انداز میں نہیں جھکتے۔ بلکہ ہم ان کے برتری کے احساس کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ اسے اپنا ایک جزو بنا لیتے ہیں۔ ذاتی خوشی کے لئے تگ و دو کو ترک کر دینا ہنگامی جذبات کے جوش کو زیر کر لینا اور اس کے برعکس پائیدار حقیقتوں کے لئے تڑپ، اسی کا نام آزادی ہے۔ اور یہی آزاد بندوں کا انداز عبودیت ہے۔ یہ آزادی تقدیر کے گیان (عرفان) سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح وہ خود ذہن کی غلام بن جاتی ہے۔ ذہن جو کسی چیز کو بھی وقت کی آتش تطہیر میں فنا ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔

مرد آزاد اپنے ہم جنسوں سے' ایک مضبوط ترین رشتے یعنی ایک مشترکہ مقدر کے رشتے میں بندھا ہوا' یوں محسوس کرتا ہے کہ ایک نئی روشنی ہر لحظہ اس کے ساتھ ہوتی ہے جو اس کے روز مرہ کے افعال کو محبت کے نور سے روشن کر دیتی ہے۔ انسان کی زندگی تاریک رات کا سفر ہے۔ جہاں چھپے ہوئے دشمن گھات میں رہتے ہیں۔ تکان اور درد سے چور وہ ایک ایسی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے جہاں تک پہنچنا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اور جہاں ماندگی کا وقفہ بہت قلیل ہوتا ہے۔ چلتے چلتے جب قہار اجل کا بلاوا آ جاتا ہے' تو ایک ایک کر کے ہمارے ساتھی ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ لمحے جن میں ہم ان کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں' بہت قلیل ہوتے ہیں۔ اور انہیں مختصر لمحوں میں ان کی اچھی یا بُری قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ کاش ہمیں یہ موقعہ ملے کہ ہم ان کی راہوں کو منور کر سکیں۔ ان کا غموں کا بوجھ ہمدردی کے دو بولوں سے ہلکا کر سکیں۔ (ان کے زخموں پر ہمدردی کا پھایا رکھ سکیں) انہیں کبھی ختم نہ ہونے والی محبت کی خالص سرخوشی عطا کر سکیں۔ ان کی ہمت بڑھائیں۔ اور مایوسی کے لمحوں میں ان کی ڈھارس بندھا سکیں۔ کاش یوں ہو کہ ہم ان کی خوبیوں اور خرابیوں کو خود غرضی کے پیمانوں سے نہ جانچیں۔ اور صرف ان کی ضرورتوں، ان کے دکھ درد اور مشکلات کو پیش نظر رکھیں۔ ان کی بے بصری کا مداوا کر سکیں جو ان کی زندگی

میں محرومی کا باعث بنتی ہے۔ کاش ہم یہ جان سکیں کہ وہ بھی اسی طرح تاریک راہوں میں مصیبت زدہ ہیں۔ اسی المیہ کے کردار میں جو ہمارا مقدر ہے۔ اور جب وہ وقت آن لگے کہ ان کی ملت ختم ہو جائے جب ان کا نیک و بد ماضی کی ابدیت میں مل کر انمٹ ہوجائے تو اس وقت ہمیں یہ طمانیت نصیب ہو کہ ان کی صعوبتوں اور ان کی محرومیوں میں ہمارے کسی عمل کا دخل نہیں تھا۔ بلکہ جب کبھی الوہی نور کا کوئی شرارہ ان کے دلوں میں جلوہ افروز ہوا تو ہم ان کے ساتھ تھے۔ ان کی ہمت بندھانے کے لئے۔ ان سے ہمدردی کا سلوک کرنے کے لئے اور جرات مندانہ الفاظ سے جن میں عالی ہمتی کی جھلک تھی' ان کو داد دینے کے لئے۔

انسان کی زندگی مختصر ہے اور بے تاب وتواں۔ اس پر اور اس کی پوری نوع پر بے رحم تاریک مقدر مسلط ہے۔ نیک و بد کے تصور سے بے بہرہ۔ بے محابا تباہی کا مظہر۔ قہار ''مادہ'' ایک بے اماں سیلاب کی صورت بہے جا رہا ہے۔ انسان کی رسائی میں تو صرف وہ عظیم تصورات ہیں جن سے اس کے شب و روز منور ہیں۔ ورنہ آج اس سے اس کی عزیز ترین متاع چھن جاتی ہے۔ تو کل اسے خود تاریکیوں کے گھاٹ اترنا ہوتا ہے۔ تقدیر کے غلام کے ہمت شکن ڈر کو حقارت سے دیکھتے ہوئے۔ اپنے ہی تعمیر کردہ معبدوں کی پرستش کرتے ہوئے اتفاقات سے بے پرواہ' وہ اپنے ذہن کو اس کھلنڈرے جبر سے جو اس کی ظاہری زندگی پر چھایا ہوا ہے' پاک رکھتا ہے۔ ناقابل مدافعت طاقتوں کا ایک فخر کے ساتھ سامنا کرتا ہے جو صرف ایک لحہ بھر کو اس کے علم اور جرات انکار کو برداشت کر لیتی ہیں۔ وہ زمین کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھکن سے چور لیکن ناقابل شکست اٹلس Atlas کی مدد کو پہنچتا ہے کہ اپنے آدرش کے اس جہان کو جسے اس نے خود تشکیل کیا ہے' بے شعور قوتوں کی یلغار سے محفوظ رکھ سکے۔

☆☆☆

میری مذہبی کشمکش

اپنے زمانے میں' میرے والدین لارڈ اور لیڈی ایمبر لے کی سیاسیات' الہیات اور اخلاقیات میں آزاد خیالی بالعموم پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ1874ء میں جب میری والدہ نے وفات پائی۔ تو انہیں مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بغیر ہی Wye Valley میں واقع اپنے گھر کے صحن میں دفن کر دیا گیا۔ میرے والد کی خواہش تھی کہ انہیں بھی وہیں دفنایا جائے لیکن1876ء میں جب وہ فوت ہوئے تو ان کی خواہش کا احترام نہ کیا گیا۔ اور انہیں چینیز Chenies میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ بلکہ والدہ کی نعش بھی وہیں منتقل کر دی گئی۔ اپنے والد کی وصیت کے مطابق ہم دونوں بھائیوں کو ان کے ایک ہم خیال دوست کی تحویل میں دیا جانا تھا۔ لیکن اس معاملے میں بھی ان کی وصیت سے قطع نظر کرتے ہوئے' عدالت نے ہمیں اپنے دادا دادی کے سپرد کر دیا۔ میرے دادا ایک مدبر سیاست دان تھے۔1878ء میں وہ بھی چل بسے۔ چنانچہ میری تعلیم و تربیت کا معاملہ اب ان کی بیوی (یعنی میری دادی) کی صواب دید پر منحصر تھا۔ وہ پہلے تو سکاٹ لینڈ کے پریس بے ٹیرین Scotch Presbyterian عقیدہ کی پیرو تھیں۔ پھر انہوں نے یونی ٹیرینUnitarian مسلک اپنا لیا۔ اس لئے مجھے ایک اتوار پریس بے ٹیرین گرجے میں لے جایا جاتا اور دوسرے اتوار یونیٹیرین گرجے میں۔ البتہ گھر میں مجھے صرف موخرالذکر عقیدے کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ اس ترمیم کے ساتھ کہ اس میں دائمی سزا اور انجیل کے متن کی صورت پر اصرار شامل نہیں تھا۔ اسی طرح اتوار کے دن کی محرمات پر بھی زور نہیں دیا جاتا تھا۔ بجز اس کے کہ تاش وغیرہ کھیلنے سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ وہ بھی ملازمین کا دل رکھنے کے لئے۔ لیکن اخلاقیات کے معاملے میں اس قسم کی ڈھیل روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ ضمیر کو خدا کی آواز گردانا جاتا تھا اور

مشکلات میں اس کی رہنمائی کو منزہ عن الخطا سمجھا جاتا تھا۔ (ہمیشہ قابل اعتماد سمجھا جاتا تھا۔)

میرا بچپن تنہائی میں گزرا۔ کیونکہ میرا بھائی مجھ سے سات برس بڑا تھا اور پھر مجھے سکول بھی نہیں بھیجا گیا۔ بیٹھ کے سوچتے رہنے کے سوا اور مجھے کوئی کام ہی نہیں تھا۔ چودہ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے میرا رجحان الہیات کی طرف ہو گیا تھا۔ آئندہ چار سالوں میں بتدریج میرا ایمان اختیار، ابدیت اور خدا پر سے اٹھ گیا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس ذہنی کشمکش کے دوران میں نے بہت کوفت اٹھائی ہے۔ لیکن اس کے اختتام پر میں نے اپنے آپ کو زمانہ تشکیک کے مقابلے میں بہت آسودہ پایا۔ اب میں اپنے طور پر غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں الہیاتی الجھنوں سے کہیں زیادہ، میری افسردگی کا سبب میری تنہائی تھی۔ اس تمام عرصے میں میں نے کسی سے مذہب کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ بجز ایک استاد کے جولاادریت کا قائل تھا۔ لیکن اسے جلد ہی رخصت کر دیا گیا۔ صرف اس بنا پر کہ وہ میری آزاد خیالی پر روک ٹوک نہیں کرتا تھا۔

مذہب کے معاملے میں جس چیز نے مجھے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کیا، وہ تضحیک کا خوف تھا۔ چودہ سال کی عمر ہی میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اخلاق کا بنیادی اصول انسانی سرخوشی کا فروغ ہونا چاہئے۔ ابتداء میں یہ اصول مجھے اتنا بدیہی نظر آتا تھا کہ میں نے فرض کر لیا تھا کہ اسے عالمگیر رائے کی حیثیت حاصل ہے۔ بعد میں مجھے یہ جان کر حیرت ہوتی کہ اس رائے کو بھی غیر روایتی (خلاف عقیدہ) سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لئے افادیت پرستی کی اصطلاح وضع کی گئی تھی۔ بہرحال مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ میں افادیت پرست ہوں، ایک گونہ مسرت حاصل ہوئی۔ لیکن میرے اس اعلان کو بھی تمسخر کے ساتھ قبول کیا گیا۔ ایک عرصہ تک میری دادی طنز کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ کوئی اخلاقی ڈھکوسلہ تمسخر کے انداز میں میرے سامنے رکھ دیتیں اور افادی نظریئے کی رو سے اس کا حل مجھ سے طلب کرتیں۔ مجھے اس وقت اور بھی حیرت ہوئی۔ جب میں ایمبر لے مخطوطات کو مرتب کر رہا تھا میں نے دیکھا کہ اسی موضوع پر میرے ایک چچا کے ساتھ بھی ان کی جوانی کے زمانے میں دادی نے یہی سلوک روا رکھا تھا۔ نتیجتاً جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے اپنی آراء کو مخفی رکھنے کا پکا فیصلہ کر لیا۔ میرے چچا نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ تضحیک و تمسخر بظاہر تو خوش طبعی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں لیکن دراصل ان کی تہہ میں جارحیت کی ایک لہر موجود رہتی ہے۔

نوجوانوں کو اسی ہتھیار کا جو عملی ظلم وستم سے کچھ ہی کم ہے تختہ مشق بنایا جاتا ہے۔ جب فلسفہ میں میرا شغف بڑھا۔ (اور بوجوہ ان دنوں فلسفہ بھی مردود و مقہور تھا) تو اسی انداز میں مجھے یہ بتایا جاتا کہ یہ مضمون تو بس دو جملوں میں سما جاتا ہے:

What is mind? No matter. What is Matter? Never mind.

(ان جملوں کا ترجمہ اردو میں اس لئے نہیں ہوسکتا کہ "Matter" اور "Mind" ان دو لفظوں کے استعمال میں اس رعایت لفظی سے کام لیا گیا ہے جسے ہمارے ہاں ایہام تو ریہ کہا جاتا ہے اور انگریزی میں Pun۔ لفظی مطلب یوں ہوتا ہے کہ ''ذہن کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں (عدم مادہ) مادہ کیا ہے چھوڑو رہنے بھی دو۔'')

جب اس چٹکلے کو دس پندرہ دفعہ دہرایا جائے تو یہ از خود بے لطف ہو جاتا ہے۔

بہرحال بہت سے معاملات میں ماحول میں کشادہ نظری موجود تھی۔ مثال کے طور پر ڈارون کے نظریات کو معمول کی بات سمجھا جاتا تھا۔ انہیں معمولات کا درجہ حاصل تھا۔ میری عمر یہی کوئی تیرہ برس کی رہی ہو گی جب میرے ایک سوس(Swiss) اتالیق نے جو قدامت پسند (روایت پرست) تھا' میری کسی بات پر انتہائی سنجیدگی سے کہا تھا ''کہ اگر تم ڈارون کے مقلد ہو' تو مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ کیونکہ ڈارون کا نظریہ اور عیسائیت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔''

مجھے اس وقت ان میں تفاوت یا عدم مطابقت کا اندازہ نہیں تھا۔ تاہم اتنی بات واضح ہے کہ اگر مجھے ان دونوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا پڑتا' تو میرا فیصلہ ڈارون کے حق میں ہوتا۔

کیمبرج میں داخلے سے پہلے' میں ہم عصر فکری رجحانات سے کم وبیش ناواقف تھا۔ میں ڈارون سے اور اس کے بعد جان سٹوارٹ مل سے ضرور متاثر ہوا تھا۔ لیکن ان دونوں کے مقابلے میں ''حرکیات'' کا اثر زیادہ گہرا تھا۔ دراصل میرا انداز نظر ڈارون کے مابعد کے زمانے کے برعکس سترھویں یا اٹھارویں صدی کے ڈیکارٹ کے معتقدین سے زیادہ مماثلت رکھتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ مادہ کی جملہ حرکات' طبیعیاتی قوانین کی پابند ہیں۔ اور ہر اعتبار سے یہ بات انسانی جسم اور دوسرے مادی اجسام پر بھی صادق آتی ہے۔ مذہب کے متعلق اپنے جذباتی شغف کے باوجود مجھے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے میں

اپنے خیالات کو یونانی حروف تہجی میں ایک کتاب میں لکھتا رہا۔ جس کا نام میں نے ''یونانی مشقیں'' رکھا تھا۔ اخفاء کو یقینی بنانے کے لئے میں نے الفاظ کے ہجوں کا ایک الگ صوتی نظام وضع کیا تھا۔ جب میری عمر پندرہ سال تھی اس وقت میں ے اس کتاب میں لکھا تھا۔ ''اولاً'' آزادی ارادہ ہی کو لیجئے۔ تو یہاں ہم انسان اور پروٹوزون میں کوئی واضح حد فاصل قائم نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اگر ہم انسان کے ارادے کی آزادی میں یقین رکھتے ہیں تو پھر ہمیں یہی آزادی پروٹوزون کو بھی دینی پڑے گی۔ اور یہ معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ چنانچہ اگر ہم پروٹوزون کے لئے آزادی ارادہ کے حق میں نہیں ہیں' تو پھر انسان کو بھی اس سے محروم رکھنا پڑے گا۔ یہ ہے تو ممکن لیکن اس کا تصور قدرے محال ہے۔ اور اس میں خدا کی مشیت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ تو پھر ہم اور جملہ حیوانات صرف کیمیائی قوتوں کے عمل سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اور ایک درخت کے مقابلے میں کسی تعجب انگیز امتیاز کے حامل نہیں۔ (اور یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی درخت کی آزادی کا قائل نہیں ہو سکتا) چنانچہ اگر ہمیں ایک خاص لمحہ میں ایک خاص فرد پر مصروف عمل' تمام قوتوں کا علم ہو (یعنی محرکات' مقاصد اور ایک خاص وقت میں دماغ کی حالت) تو ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکیں گے کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔''

میں اٹھارہ سال کی عمر میں خدا پر تو ایمان رکھتا تھا لیکن وحی و رسالت کا منکر تھا۔ وہ اس لئے کہ غایت اولیٰ کا نظریہ میرے نزدیک ناقابل تردید تھا۔ پھر جان سٹوارٹ مل کی خود نوشت سوانح حیات میں مجھے اس کی تردید مل گئی۔ جیمز مل سے اس نے یہ نکتہ اخذ کیا تھا کہ اس نظریے کی رو سے اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ ''پھر خدا کو کس نے بنایا؟'' یہ بات تعجب انگیز ہے کہ مل نے مجھ پر اتنا گہرا اثر کیوں چھوڑا۔ یہ تو درست ہے کہ وہ میرے والدین کا دوست تھا۔ اور ان کی بہت سی آراء کی تشکیل میں اس کا ہاتھ تھا۔ لیکن اس کا علم تو مجھے بہت بعد میں ہوا تھا۔ چنانچہ یہ جانے بغیر کہ میں اپنے والدین کے نقش قدم پر چل رہا تھا میں نے کیمبرج میں داخلے سے پہلے مل کی ''کتاب منطق'' اور ''قومی اقتصادیات'' (Logic) (Political Economy) کا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے ان کا خلاصہ بھی تیار کیا تھا۔ اور اس میں یہ التزام برتا تھا کہ ہر پیرے کا مفہوم ایک فقرے میں ادا ہو جائے۔ اصول ریاضی میں میری دلچسپی کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ تاہم اس نے خالص ریاضی کو تجرباتی سائنس میں مدغم کرنے جو کوشش کی تھی میں اس سے قطعاً مطمئن نہیں تھا۔ اب تو اس نظریہ کو کلی طور پر رد

کر دیا گیا ہے۔

میں نے عنفوان شباب میں وسیع مطالعہ کیا۔ لیکن میری رسائی تاحال صرف میرے دادا کی لائبریری تک تھی۔ جو کتابیں میں نے پڑھیں ان میں سے بہت کم کا تعلق میرے اپنے عہد سے تھا۔ یوں بھی کتابوں کا یہ ذخیرہ اپنی نوعیت میں کچھ عجیب سا تھا۔ اس میں جو کتابیں میرے لئے اہم ثابت ہوئیں' ان میں مل مین کی ''تاریخ عیسائیت'' کے علاوہ گبن' کامٹ' دانتے' میکاولی' سوفٹ اور کارلائل کی کتابیں شامل تھیں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ شیلے کی کوئی کتاب ان الماریوں میں مجھے نظر نہ آئی حالانکہ وہ میرے دادا کا ہم عمر تھا۔ دونوں کا ماہ پیدائش بھی ایک تھا۔

کیمبرج پہنچنے کے بعد کہیں جا کر مجھے جدید رجحانات سے آشنائی حاصل ہوئی۔ یعنی وہ رجحانات جو1890ء کی دہائی کے اوائل میں جدید سمجھے جاتے تھے۔ البسن' شا' فلابرٹ' اور بیٹر' والٹ وہٹمین' نٹشے وغیرہ۔ البسن کے علاوہ ان لوگوں میں سے کسی نے بھی مجھے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ان ایام میں جن دو اشخاص نے میری سوچوں میں انقلاب پیدا کیا' ان میں پہلے تو میک ٹیگرٹ ہے' جس نے مجھے ہیگل کا پیرو بنا دیا۔ اور پھر بعد میں جب میں فیلو (Fellow) منتخب ہو چکا تھا تو جی اے مور(Moore) نے اس کے برعکس میرے خیالات کو پھر اسی پرانی ڈگر پر ڈال دیا جو میں نے کیمبرج جانے سے پہلے اختیار کی تھی۔ گویا یوں کہئے کہ جو کچھ میں نے کیمبرج میں حاصل کیا تھا، وہ بعد میں بادل نخواستہ مجھے بھلانا پڑا۔ اس طرح جو کچھ میں نے اپنے طور پر کنج تنہائی میں حاصل کیا تھا، بحثیت مجموعی وہ زیادہ دیرپا اور مستحکم ثابت ہوا۔

جرمنی کی عینیت پسندی کے اثرات انگلینڈ میں یونیورسٹیوں کی حدود سے باہر کم کم ہی محسوس کئے گئے۔ تاہم میری جوانی کے زمانے میں یونیورسٹیوں کے اندر اسے غلبہ حاصل تھا۔ آکسفورڈ میں اس کا اثر ونفوذ گرین(Green) اور کیرڈ(Caird) کا مرہون تھا۔ ان کے علاوہ بریڈلے اور جوزن کٹ(Bosenquet) جو1890ء کی دہائی میں انگلستان کے اہم ترین فلسفی تھے دوسروں کے مقابلے میں ہیگل سے زیادہ متفق الرائے تھے۔ تاہم کسی خاص وجہ سے جو میرے علم میں نہیں' وہ اس کے حوالے سے گریز کرتے تھے۔ البتہ کیمبرج میں اب بھی سج وک(Sidgwick) بینتھم کی روایت کا علمبردار تھا۔ وارڈ' کانٹ کا پیروکار تھا۔ لیکن ان میں

سے کم عمر طبقہ جس میں سٹاؤٹ میکنزی' اور میک ٹیگرٹ شامل تھے، اپنے اپنے طور پر ہیگل کے معتقد تھے۔

عیسائی مذہب کے معتقدات شدید باہمی اختلافات کے باوجود ہیگل کو قبول کرنے میں مانع نہیں آتے تھے۔ اس کے فلسفے کی رو سے کسی چیز کو بھی کامل سچائی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ ہی مکمل طور پر جھوٹ۔ ہر بات جزوی صداقت کی حامل ہوتی ہے۔ اور لوگوں کو کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی ہوتا ہے۔ تاہم انہیں ''سچ' صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں'' پر عمل پیرا نہ ہو سکنے کے باعث مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بریڈلے کا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ایسی باتوں سے گریز کریں جو عقلی طور پر تصحیح طلب ہوں۔ آگے بڑھنے کے لئے صرف ایک صورت ہے یعنی فکر اور جذبے کا امتزاج۔ لیکن جب ہم اس منزل پر پہنچیں گے تو ہمارے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تصورات میں صداقت کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ ان مدارج کا مدار اس موقعہ پر ہوتا ہے جس موقعہ پر وہ جدلیاتی نظام میں ڈھلتے ہیں۔ تصور خدا میں صداقت کا عنصر اس لئے زیادہ ہے کہ وہ اس مرحلے میں کافی دیر کے بعد داخل ہوتا ہے۔ تاہم یہ بھی مکمل صداقت کا علمبردار نہیں۔ کیونکہ بالآخر اسے بھی عین مطلق میں مدغم ہونا پڑتا ہے۔ ہیگل کے دائیں بازو کے معتقدین تصور خداوندی میں صداقت کے جزو پر زور دیتے ہیں۔ اور بائیں بازو والے اس کے دروغ پر۔ ہیگل کے جرمن پیروکار کو جب کوئی مذہبی منصب سونپا جائے تو اس کے پیش نظر صرف یہ بات ہوتی ہے کہ تصور الوہیت میں (تعدد الہ کے مقابلے میں) سچ کا عنصر غالب ہے۔ لیکن اگر وہ سرکاری عہدیدار ہو تو اس حال میں وہ عین مطلق میں مضمر اس برتر سچائی پر یقین کرے گا جس کی ارضی نقل جرمن حکومت ہے۔

انگلستان میں فلسفے کے اساتذہ' تقریباً سب کے سب بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ بریڈلے کہتا ہے کہ ''مذہب عملی نوعیت کا حامل ہے اور اسی اعتبار سے ''خیر'' کا تصور اس میں غالب ہے'' تاہم اس تصور کے باطن میں ایک لاینحل تضاد موجود ہے۔ مذہب میں اب بھی بے لچک عناصر کا دور دورہ ہے۔ جن میں باہم تطبیق ممکن نہیں۔ چنانچہ اس میں مستقلاً پس و پیش کی کیفیت اور مصالحانہ انداز پایا جاتا ہے۔ بریڈلے اور ربوزن کٹ (Bosen quet) دونوں فرد کی بقائے دوام کے قائل نہیں۔ جب میں فلسفے کا طالبعلم تھا تو میکنزی نے اپنے

مقالے میں جسے سننے کا مجھے موقعہ ملا تھا، کہا تھا کہ ''شخصی خدا کا تصور ایک معنوں میں داخلی تضاد کا حامل ہے۔'' بعد میں وہ میرے ممتحنوں میں بھی شامل رہا۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ ان لوگوں کا تصور الوہیت ایسا نہ تھا جو راسخ العقیدہ لوگوں کے لئے قابل قبول ہوتا۔ تاہم اسے مخاصمانہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک مذہب صداقت مطلقہ کا ایک لازمی جزو ضرور تھا۔ لیکن اگر اسے صداقت تامہ قرار دیا جائے تو یہ غلط ہوگا۔ اس قسم کا تصور جو میں نے قبل ازیں قائم کیا تھا کہ ''خدا ہے یا نہیں ہے اور غالباً نہیں ہے'' ان کے نزدیک بچگانہ تھا۔ ان کے نزدیک صحیح دلیل یوں قائم ہوگی کہ ایک اعتبار سے دیکھیں تو خدا ہے لیکن دوسرے زاویئے سے دیکھیں تو نہیں ہے۔ لیکن زاویہ کمال سے یوں نظر آئے گا کہ ''ہے'' اور ''نہیں ہے'' دونوں بے معنی ہیں۔

میک ٹیگرٹ۔ جو کیمبرج میں میرے ہم عصروں کی سوچ اور فکر کا روح و رواں تھا ہیگل کے معتقدین میں کئی لحاظ سے ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں جدلیات کا زیادہ قائل ہے اور اس کی جزئیات تک کا دفاع کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ملحد کہتا تھا۔ لیکن بقائے دوام کا قائل تھا۔ جس کے لئے اسے یقین تھا کہ اس کے پاس منطقی ثبوت موجود ہے۔ وہ مجھ سے چار سال آگے تھا۔ میرے پہلے سال میں یونین کا صدر وہی تھا۔ ہم دونوں اتنے کم آمیز تھے کہ مجھے داخل ہوئے ابھی دو ہفتے ہی گزرے تھے کہ وہ مجھے ملنے آیا تو کمرے کے اندر قدم رکھنے سے ہچکچاتا رہا۔ اور مجھے بھی یہ توفیق ارزانی نہ ہوئی کہ اسے اندر آنے کی دعوت دیتا۔ چنانچہ وہ تقریباً پانچ منٹ تک دہلیز پر ہی کھڑا رہا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب گفتگو فلسفہ پر مرکوز ہوگئی تو اس کا حجاب ختم ہوگیا۔ اس گفتگو کے دوران مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اخلاقیات، منطق اور مابعد الطبیعیات کے متعلق میرا موقف ایک ناقابل فہم طریق کار سے مکمل طور پر رد کر دیا گیا تھا۔ اور میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ اور اسی تکنیک سے مجھے یہ بھی باور کرا دیا گیا کہ بقائے دوام میرا مقدر ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بزرگ نسل جسے لایعنی قرار دیتی تھی۔ نئی نسل کے لئے وہ بامعنی تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر ہمدردانہ غور و خوض کا فیصلہ کر لیا۔ اور ایک عرصہ تک تو میں بالفعل اس کا قائل بھی رہا۔ جی اے مور پر بھی ایک قلیل تر عرصے کے لئے یہی واردات گزری تھی۔ لیکن اگر اس نے یہ محسوس کیا کہ میز کرسی، ہیگل کے فلسفے کی زد میں نہیں آتے تو میں نے یہ جان لیا کہ ریاضی پر بھی اس کا اطلاق نہیں

ہوتا۔ چنانچہ یہ اسی کا فیض تھا کہ میں اس قعر سے ابھر آیا۔ ریاضیاتی منطق کی سان پر چڑھی عقل سلیم کی طرف لوٹ گیا۔

1890ء کی دہائی میں عقل و دانش کے رجحانات' میرے والد کے زمانہ شباب کے مزاج سے بہت مختلف تھے۔ بعض معاملات میں اصلاح پذیر لیکن اکثر معاملات میں خراب تر۔ ذہین نوجوانوں کے لئے عیسائی مذہب کے معتقدات سے اب تعلق خاطر باقی نہیں رہا تھا۔ وہ سبھی لاادریت کی طرف مائل تھے۔ اب انہیں حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے متعلق مباحث سے کوئی سروکار تھا نہ انجیل کے تنقیدی مطالعہ سے۔ مجھے وہ حقارت آمیز کیفیت اب بھی یاد ہے، جو میں نے اس وقت محسوس کی تھی جب مجھے یہ پتہ چلا کہ خدا کے وجود کے اثبات کے لئے ہنری سج وک نے اولاً سامی زبانوں کی تحصیل ضروری سمجھی تھی۔ میرے خیال میں اس کے لئے کوئی منطقی قرینہ موجود نہیں تھا۔ تاہم اپنے دوسرے ہم عمر ساتھیوں کی طرح میں بھی خدا کے وجود یا عدم وجود' بقائے دوام' آزادی ارادہ وغیرہ کے متعلق مابعد الطبیعیاتی دلائل میں دلچسپی لیتا رہا۔ میں نے ان مسائل کو ناقابل توجہ صرف اس وقت جانا جب مجھے نیا منطقی شعور حاصل ہوا۔

1890ء کی دہائی کے وہ نامور دانشور جو تدریسی علوم سے وابستہ نہیں تھے' مثلاً البسن' سٹرن برگ' نٹشے اور (ایک محدود عرصے کے لئے) آسکر وائیلڈ' وہ بھی اپنے سے پہلے کی نسل سے بہت مختلف تھے۔1860ء کی دہائی کے سب بڑے آدمی نیک خو تھے۔ صابر اور محنت کش' وہ کسی تبدیلی پر اس وقت رضامند ہوتے تھے جب تفصیلی اور محتاط تحقیق سے وہ اس نتیجے پر پہنچتے کہ وہ موجودہ ناگزیر ہے۔ وہ اصلاحات کے حامی تھے اور بالعموم ان کی حمایت کامیابی سے ہمکنار بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ دنیا میں ان کی وجہ سے سریع تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ لیکن بایں ہمہ وہ ''باغی'' قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس وقت باغی موجود ہی نہیں تھے' بے شک تھے اور انہوں نے اپنے بہترین کارنامے اسی دہائی میں سرانجام دیئے۔ مثال کے لئے صرف دو نام کافی ہیں۔ یعنی مارکس اور دستوفسکی۔ تاہم اس وقت انہیں ثقافتی منظر پر زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ ان کے اثرات کو بہت بعد میں قبول کیا گیا۔ ان دنوں جن لوگوں کو انگلستان میں احترام اور وقار حاصل ہوا' وہ ڈارون' ہکسلے' نیومین تھے۔ ''مقالات'' اور ''تبصرے'' Essays and Reviews وغیرہ کے مصنفین' بنیادی طور پر

معاشرے کے خلاف برسر پیکار نہ تھے۔ وہ باہم مل بیٹھنے اور شائستہ طریقے سے اس مسئلے پر گفتگو کے اہل تھے کہ ''خدا ہے'' جیسا کہ ''مابعد الطبیعیاتی سوسائٹی'' کے جلسوں سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ بعد میں ان میں مناقشات نے جڑ پکڑ لی تھی۔ اور سر ماؤنٹ سٹوارٹ گرانٹ ڈف سے جب بعد میں ایک موقعہ پر سوال کیا گیا کہ کیا خدا واقعی موجود ہے۔تو اس نے جواب دیا کہ ہمیں اس مسئلے پر واضح اکثریت حاصل ہے۔ گویا ان دونوں الہیات میں بھی جمہوریت کا دور دورہ تھا۔

لیکن1890ء کی دہائی میں نوجوان نسل' زیادہ تیز رو' پرجوش اور جری تھی۔ نرم خوئی انہیں راس نہیں آتی تھی۔ بربادی اور دہشت گردی کا رجحان جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، پہلے پہل ادب میں رونما ہوا۔ ان میں سٹرن برگ' نٹشے' بہت گرم مزاج تھے۔ ان کا غیظ وغضب وجوہات کا محتاج نہیں تھا۔ وہ مزاجاً ہی تلخ تھے۔ چنانچہ ان سب میں سے ہر ایک نے زندگی کے متعلق ایک ایسا رویہ اختیار کیا جو غصے کا جواز فراہم کرتا تھا۔نوجوان ان کے جذب و جوش کو پسند کرتے تھے۔اس میں انہیں پدری تحکم کے خلاف اپنے جذبات کے اظہار کی راہ نظر آتی تھی۔ آزادی پر اصرار اپنے طور پر اتنا باوقار جذبہ تھا کہ اس کے اندر ہی تشدد کے لئے جواز موجود تھا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ تشدد تو بالفعل درآیا۔لیکن اس عمل میں آزادی کہیں گم ہوگئی۔

میں کیونکر لکھتا ہوں

ادب میں نوبیل انعام حاصل کرنے والوں میں سے شاید ہی کسی نے اپنے اسلوب تحریر کی اس طرح وضاحت کی ہوگی جیسی ہمیں ذیل کے مضمون میں نظر آتی ہے۔ اس (رسل) کے ہاں موضوع کی جزئیات (تفصیلات) پر مکمل عبور کے ساتھ ان کی پیشکش اتنی صحت کے ساتھ کی جاتی ہے کہ اس کے نکتہ نظر کے متعلق کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اس سے اتفاق کریں یا اختلاف۔ اس نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے اس میں فکری بلندی اور ذہنی سلامت روی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس کا مخصوص اسلوب اسی چیز کا فطری نتیجہ ہے۔ اسی لئے نوبیل انعام کے ذریعے اس کا اعتراف کچھ تعجب خیز نہ تھا۔

اگرچہ رسل کو اصرار ہے کہ اس کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا مضمون ''ایک آزاد خیال شخص کی عبادت'' اب اسے اچھا نہیں لگتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسل کی تحریروں کا کوئی منتخب مجموعہ اس مضمون کی شمولیت کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جائے گا۔ بیسویں صدی کی بہترین نثر کے کسی انتخاب سے اس مضمون کو حذف کرنے کے لئے جواز مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے بھی نمونۃً اس کے بعض دوسرے انشائیے اور دو مختصر کہانیاں، اس مجموعے میں شامل کی ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ان کی اشاعت پر وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔

(رابرٹ ای ایگزاور لیسٹر۔ ای۔ ڈینن)

سچی بات تو یہ ہے کہ میں انشاء پردازی کے فن سے ناواقف ہوں۔ یہ تو کوئی ماہر فن نقاد ہی کہہ سکتا ہے کہ مجھے اپنی تحریر کو بہتر بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ (نہ مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ اپنی تحریر کو بہتر بنانے کے لئے ماہر فن نقاد مجھے کیا مشورہ دینا چاہے گا) میں تو بس یہ کر سکتا ہوں کہ اس ضمن میں جو کوششیں میں نے کی ہیں، ان کے متعلق کچھ تفاصیل

آپ کے سامنے رکھ دوں۔

21 سال کی عمر کو پہنچنے تک میری تمنا یہ رہی کہ میں جہاں تک بھی ہو سکے' جان اسٹوارٹ مل کے اسلوب کا تتبع کروں۔ مجھے اس کے فقروں کی ساخت اور اپنے موضوع کو بتدریج آگے بڑھانے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا۔ تاہم میرے سامنے ایک قدرے مختلف معیار بھی تھا۔ جسے میں نے غالباً ریاضی سے اخذ کیا تھا۔ میں اپنے بات کو ممکنہ حد تک صفائی کے ساتھ مختصر ترین الفاظ میں بیان کرنا چاہتا تھا۔ شاید میں یہ سمجھتا تھا کہ دوسرے ادبی اسالیب کے مقابلے میں بیڈکر(Baedker) کا تتبع زیادہ سودمند ہوگا۔ میں پہروں تک مختصر ترین الفاظ میں کسی الجھاؤ کے بغیر بات کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ اور اس معیار کے حصول کے لئے میں جمالیاتی نزاکتوں کو بھی نظر انداز کرنے پر آمادہ تھا۔

21 برس کا ہو جانے کے بعد میں ایک اور سمت میں چل نکلا۔ جس میں میرے ہونے والے برادر نسبتی لوگن پیرسل سمتھ کو بہت دخل تھا۔ اس وقت وہ اسلوب اور صرف اسلوب کا دلدادہ تھا۔ نفس مضمون سے اسے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ فلابیئر اور والٹر پیٹر کا دلدادہ اور شیدا تھا۔ اور مجھے بھی یہ یقین ہو چلا تھا کہ انشاء پردازی سیکھنے کے لئے ان کے طرز کے تتبع سے بہتر اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ اس نے مجھے کئی گر بتائے تھے۔ لیکن اب صرف دو یاد رہ گئے ہیں۔ ہر چار لفظوں کے بعد وقفہ(Comma) آنا چاہئے۔ اور دوسرے یہ کہ حرف عطف ''اور'' نئے فقرے کے آغاز کے علاوہ اور کہیں استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن جس بات پر اس نے سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھی کہ ہر تحریر کو ہمیشہ دوبار لکھنا چاہئے۔ میں نے اس پر پوری ایمانداری سے عمل کیا۔ تاہم مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرا پہلا مسودہ بالعموم دوسرے کے مقابلے میں بہتر ہوتا تھا۔ یہ بات جان لینے سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میرا بہت سا وقت بچ گیا۔ میں یہ بات نفس مضمون کے حوالے سے نہیں کہہ رہا۔ اس کا تعلق صرف تحریر کے اسلوب سے ہے۔ جب بھی مجھے اپنی کسی فاش غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ تو میں پورے کے پورے مسودے کو از سر نو لکھتا ہوں۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ ہے کہ جب ایک فقرہ مفہوم ادا کر رہا ہو تو پھر میں اس کو کیونکر بہتر بنا سکتا ہوں۔

آہستہ آہستہ مجھے ان طریقوں پر عبور حاصل ہوتا گیا جن کے ذریعے لکھتے وقت الجھن اور اضطراب کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ اوائل عمری کے زمانے میں جب بھی کوئی سنجیدہ منصوبہ

میرے پیش نظر ہوتا تو ایک طویل عرصے تک مجھے یہ محسوس ہوتا کہ میں کبھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکوں گا۔ ایک خلجان میرے اعصاب پر سوار رہتا کہ یہ کام کسی صورت بھی ٹھیک سے نہیں ہو پائے گا۔ میں یکے بعد دیگرے کئی ناکام کوششیں کرتا۔ اور بالآخر خود ہی انہیں رد کر دیتا۔ یہ بات کہیں بعد میں جا کر میری سمجھ میں آئی کہ اناڑی پن سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ تو صرف تضیع اوقات ہے۔ اب میں نے یہ جان لیا کہ جب کسی کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں آجائے، تو اس پر ابتدائی غوروخوض کے بعد ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ میں اس موضوع کو اپنے تحت الشعور میں نشوونما پانے کے لئے چھوڑ دوں۔ نشوونما کا یہ وقفہ جلد بازی کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اصل میں بالارادہ شعوری سوچ بچار پختگی کے اس عمل کی راہ میں خارج ہوتی ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ ازخود میری سمجھ میں یہ بات آجاتی کہ میں غلطی پر تھا۔ جس کتاب کا خاکہ میں نے بنایا تھا وہ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ خوش قسمتی اس وقت میرا ساتھ دیتی۔ کہ جب میں ایک عرصہ تک گہرے غوروخوض کے بعد مسائل کو تحت الشعور میں جڑیں پکڑنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ تاآنکہ ایک دن اچانک مسئلے کا حل تابناک وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا۔ اب صرف اس الہامی نوعیت کے انکشاف کو ضبط تحریر میں لانے کا کام باقی رہ جاتا۔

اس طریق کار کی سب سے زیادہ حیرت انگیز مثال جس نے بعد میں مجھے اس پر عمل پیرا ہونے کی جرات عطا کی، 1914ء کے اوائل میں سامنے آئی۔ میں نے بوسٹن میں لاول (Lowell) خطبات دینے کی ہامی بھر لی تھی۔ ان خطبات کے لئے میں نے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ تھا ''خارجی کائنات کے متعلق ہمارا علم۔'' 1913ء کا تمام سال میں نے اس موضوع پر سوچ بچار میں گزار دیا۔ کالج میں پڑھائی کے ایام میں کیمبرج میں اپنے کمرے میں اور تعطیلات کے دوران۔ دریائے ٹیمز کے بالائی حصے میں ایک پُرسکون فرودگاہ میں۔ اس موضوع پر میں نے اتنی شدت سے غور کیا کہ بعض اوقات میرا دم گھٹنے لگتا۔ اور میں غلبہ حال سے ہانپنے لگتا۔ لیکن یہ سب کچھ بے مصرف تھا۔ جو نظریہ بھی میرے ذہن میں ابھرتا، اس کے خلاف ناقابل تردید اعتراضات سامنے آجاتے۔ مایوسی کے اسی عالم میں بالآخر میں کرسمس کے موقع پر روم چلا گیا۔ خیال یہ تھا کہ کچھ دنوں کی تفریح شاید میری کھوئی ہوئی توانائی کو بحال کر دے۔ 1913ء کے آخری دن میں کیمبرج واپس پہنچا۔ اگرچہ میری الجھن بدستور باقی تھی تاہم یہ سوچ کر کہ وقت تھوڑا باقی رہ گیا ہے۔ میں نے ایک سٹینوگرافر سے

معاملہ طے کیا کہ جیسے بھی ہو میں خطبات کو املاء کرادوں۔ اگلی صبح جیسے ہی وہ سٹینوگرافر میرے دروازے پر نمودار ہوئی تو جو کچھ مجھے کہنا تھا' وہ یک لخت میرے ذہن میں واضح ہو گیا۔ چنانچہ ایک لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر پوری کتاب کی املاء کا کام شروع ہو گیا۔

میں مبالغہ سے کام نہیں لوں گا۔ کتاب بہرحال بہت ناقص تھی۔ اور اب بھی مجھے اس میں بہت سی فاش غلطیاں نظر آتی ہیں۔ تاہم اس وقت میں جو کچھ کر سکتا تھا اس لحاظ سے یہی بہترین کوشش تھی۔ اگر میں نے تساہل سے کام لیا ہوتا تو جتنا وقت مجھے میسر تھا، اس کے اندر میں جو کچھ بھی لکھتا وہ اس تحریر کے مقابلے میں بہت کمتر درجے کا ہوتا۔ میں دوسرے لوگوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے لئے یہی طریقہ کارآمد ثابت ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فلابر(Flaubert) اور پیٹر(Pater) کو بھلا کر میں نے اچھا ہی کیا۔

یہ درست ہے کہ طرزتحریر کے متعلق میرا موقف اس رویئے سے زیادہ مختلف نہیں ہے جو میں نے 18 سال کی عمر میں اپنایا تھا۔ تاہم میرا ارتقاء خط مستقیم میں نہیں ہوا۔ اس صدی (بیسویں صدی) کے اوائل میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب میرے انداز میں رنگیں بیانی اور خطابت کو غلبہ حاصل تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے ''ایک آزاد خیال شخص کی عبادت'' سپردقلم کیا تھا۔ اب مجھے یہ اسلوب بھلا نہیں لگتا۔ اس وقت میں ملٹن کی نثر کے سحر میں گرفتار تھا۔ اس کے جملوں کا بلند آہنگ میرے ذہن کی گہرائیوں میں گونج کی لرزش پیدا کرتا تھا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ اب میں اس اسلوب کا معترف نہیں ہوں' لیکن میرے لئے اس کا تتبع ایک لحاظ سے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ دراصل نقل ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ ''کتاب دعا''(Prayer Book) اور انجیل کے سرکاری انگریزی ترجمے سے بہتر اسلوب کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وہ جس فکر اور احساس کی ترجمانی کرتا ہے وہ ہمارے عہد کے فکر و احساس سے مختلف ہے۔ اسلوب تبھی اچھا کہلا سکتا ہے جب وہ مصنف کی شخصیت کا پُرخلوص اور بے تکلف اظہار ہو۔ اور یہ بھی اس صورت میں جب مصنف کی شخصیت اظہار کے لائق ہو۔ ''نقل راچہ عقل'' سے ہمیشہ بچنا چاہئے۔ تاہم اچھی نثر کے اسالیب سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ بالخصوص نثری آہنگ کو اخذ کرنے کے لئے۔ اس کے بغیر نثر میں جو آہنگ پایا جاتا ہے اس کا شعور حاصل نہیں ہوتا۔

نثر نگاری کے لئے کچھ سادہ اصول میرے خیال میں مفید مطلب رہیں گے۔ تاہم یہ

اصول اتنے سادہ بھی نہیں۔ جیسے میرے برادر نسبتی لوگن پیرسل سمتھ (Logan Pearsall Smith) نے مجھے تعلیم کیئے تھے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر سادہ لفظ موجود ہو تو کبھی مشکل لفظ استعمال نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ کا بیان بہت سی چیزوں سے مشروط ہو تو ان میں سے مختلف تحویلات (شرائط) کے بیان کے لئے الگ فقرہ استعمال کیجئے۔ تیسرے یہ کہ فقرے کے آغاز میں قاری کے ذہن میں ایسے تاثرات جنم نہ لیں جن کی فقرے کے آخر میں نفی ہو جائے۔ مثال کے طور پر اس فقرے کو لیجئے۔ جو عمرانیات کے موضوع پر کسی بھی کتاب کی زینت بن سکتا ہے:

''نوع انسان کے افراد۔ ناقابل قبول طرز عمل سے کاملاً صرف اس حال میں مستثنیٰ قرار پاتے ہیں جب بعض پیشگی شرائط جو صرف معدودے چند حالتوں میں پوری ہوتی ہیں۔ بعض موافق حالات کی وجہ سے ان کی نوعیت خلقی ہو یا ماحولیاتی' اتفاقیہ طور پر مجتمع ہو کر ایک ایسے فرد کو تخلیق کر دیں' جس کے وجود میں بہت سے اجزاء ایک معاشرتی طور پر بہتر (سودمند) طریقے سے معاشرتی معیار سے انحراف پذیر ہوں۔''

آیئے کوشش کر دیکھتے ہیں کہ کیا اس فقرے کو آسان زبان میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں اسے یوں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ ''کم و بیش تمام انسان بدقماش ہوتے ہیں۔ وہ جو اس ذیل میں نہیں آتے وہ لازماً پیدائشی طور پر اپنی تربیت میں خلاف معمول حد تک خوش قسمت ہوتے ہیں۔'' یہ مختصر بھی ہے اور زیادہ قابل فہم بھی۔ اور مفہوم کو بخوبی ادا کر رہا ہے' تاہم مجھے خدشہ ہے کہ اگر کوئی پروفیسر اس دوسرے جملے کو ترجیح دے تو شاید اسے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں۔

یہاں میرے ان قارئین کے لئے جو پروفیسر کے مرتبے پر فائز ہوں' ایک نکتہ قابل غور ہے۔ مجھے سادہ زبان استعمال کرنے کی اجازت اس لئے ملی ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ اگر میں چاہتا تو ریاضیاتی منطق کی زبان سے کام لے سکتا تھا۔ مثلاً یہ بیان دیکھئے ''بعض لوگ اپنی مرحوم بیویوں کی بہنوں سے شادی کر لیتے ہیں۔'' میں اسی فقرے کو ایک ایسی زبان میں بھی ادا کر سکتا ہوں۔ جو سالہا سال کے مطالعہ کے بعد گرفت میں آتی ہے۔ میری آزادی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اس لئے میں نوعمر پروفیسر حضرات کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی اولین تصنیف ایک ایسی غیر مانوس زبان میں تحریر کریں جسے صرف چند ماہرین ہی سمجھ سکتے ہوں۔

اس پس منظر کے حصول کے بعد وہ ہمیشہ ایسی زبان میں اپنا مافی الضمیر پیش کر سکتے ہیں جسے عوام سمجھتے ہوں۔ فی زمانہ جبکہ ہمارا جینا مرنا پروفیسروں کے رحم و کرم پر ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر انہوں نے میرا مشورہ قبول کر لیا تو وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہوں گے۔

دانش کا کباڑ خانہ

''انسان ایک عاقل حیوان ہے'' ـــــ کم از کم مجھے تو یہی بتایا گیا ہے اور پھر میں نے اپنی طویل زندگی میں اس کا ثبوت تلاش کرنے میں سعی بلیغ کی۔ تین براعظموں میں پھیلے ہوئے ملکوں کی سیاحت بھی کی لیکن اس کا ثبوت نہ ملنا تھا سو نہ ملا۔ اس کے لئے میں نے دنیا کی ان عظیم قوموں کو دیکھا جو کل تک تہذیب و تمدن کے قافلے کی سرخیل تھیں کہ بلند بانگ لایعنیت رلغویت کے مبلغین نے انہیں قعر مذلت میں دھکیل دیا۔ میں نے ظلم' عقوبت اور توہم پرستی کو دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے دیکھا۔ نوبت اب یہاں تک آ پہنچی ہے کہ جہاں عقلیت کی تعریف و توصیف اس وقیانوسی بوڑھے کے مماثل قرار پاتی ہے جو بدقسمتی سے کہیں ماضی بعید کے غاروں سے بچ کر نکل آیا ہو۔ یہ مایوس کن صورت حال ہے' لیکن مایوسی ایک بے مصرف جذبہ ہے اس سے بچنے کے لئے میں نے مجبوراً ماضی کا مطالعہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ توجہ سے شروع کیا۔ اور ایراس مس کی طرح اس نتیجہ پر پہنچا کہ حماقت ہے تو سدا بہار' تاہم انسانیت کسی نہ کسی طور اس سے بچ نکلی ہے۔ جب ہم ماضی سے مقابلہ کرتے ہیں تو اپنے زمانے کی حماقتوں کو جھیلنا آسان ہو جاتا ہے۔ آنے والے صفحات میں میں اپنے زمانے کی حماقتوں کو اگلے زمانوں کی حماقتوں کے ساتھ ملا کر پیش کروں گا۔ اس طرح شاید اپنے عہد کو ان کے تناظر میں دیکھنے میں مدد ملے۔ اور ہم یہ جان سکیں کہ وہ بدتر حالات' جن سے ہمارے آباؤ اجداد عہدہ برآ ہو کر مکمل تباہی سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے' آج ہم ان کے مقابلے میں زیادہ بدتر حالات سے دو چار نہیں ہیں۔

جہاں تک میں جانتا ہوں، ارسطو وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ انسان

عاقل حیوان ہے۔ اس نے ثبوت کے طور پر جو دلیل پیش کی' وہ آج اتنی مؤثر نظر نہیں آتی یعنی یہ کہ بعض انسان ریاضی کے سوالات حل کر سکتے ہیں۔ اس کے نزدیک روح کی تین اقسام یا درجات تھے۔ روح نباتاتی جو ہر زندہ شے میں موجود ہے' خواہ وہ پودے ہوں یا حیوانات۔ اس کا تعلق صرف نشوونما سے تھا۔ دوم روح حیوانی جو اجسام کو خود حرکتی کی اہلیت عطا کرتی ہے۔ یہ انسانوں اور حیوانوں میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے۔ اور سوم روح عقلی یا ذہانت ہے جو ہے تو الوہی ذہن کا خاصہ تاہم اس میں انسان بھی اپنی دانائی کے مطابق حصہ پاتے ہیں۔ اسی ذہانت کی بدولت انسان ذی عقل حیوان قرار پاتا ہے۔ ذہانت کا اظہار کئی طریقوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مکمل اظہار کی صورت' ریاضی پر دسترس ہے۔ یونانی نظام ہندسہ بہت ناقص تھا۔ حتیٰ کہ ان کا ''پہاڑوں'' کا نظام بھی بہت مشکل تھا۔ چنانچہ الجھی ہوئی ضرب و تقسیم صرف قابل ترین لوگوں کے بس کی بات تھی۔ آج کل ضرب و تقسیم کے آلے ذہین ترین شخص کے مقابلے میں بھی تیزی سے حساب کتاب کر سکتے ہیں۔ تاہم کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ آلات لافانی ہیں۔ یا الوہی اشارے پر کام کرتے ہیں۔ جوں جوں علم ریاضی آسان (سہل الحصول) ہوتا گیا ہے' اتنا ہی اس کا احترام بھی کم ہوتا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ آج بھی اکثر فلسفی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ ہم کتنے اچھے لوگ ہیں۔ تاہم وہ یہ ثناء خوانی ریاضی میں مہارت کی بنا پر نہیں کرتے۔

اس زمانے کا چلن ہمیں یہ اجازت نہیں دیتا کہ ضرب تقسیم میں مہارت کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ انسان حیوان عاقل ہے۔ اور روح جزوی طور پر ہی سہی لافانی ہے۔ چنانچہ ہمیں انسانی برتری کو کہیں اور تلاش کرنا پڑے گا۔ تو پھر پہلے کہاں چلیں؟ کیا ہم سیاست دانوں کا حوالہ دے سکتے ہیں جنہوں نے دنیا کو موجودہ مقام پر لا کھڑا کیا ہے؟ ہماری نظریں عالموں کی طرف بھی اٹھتی ہیں اور فلسفیوں کی طرف بھی۔ یہ سب اپنے اپنے مقام پر فضیلت کے حق دار ہیں لیکن میرے خیال میں ہمیں ابتداء ان ہستیوں سے کرنی چاہئے جنہیں تمام خوش فکر لوگ عاقل ترین اور بہترین انسان مانتے ہیں' میری مراد کلیسا کے علماء سے ہے۔ اگر یہی لوگ عقل اور خرد کا دامن چھوڑ دیں' تو پھر ہم جیسے کمتر اخلاق کے حامل لوگوں کے لئے کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ لیکن حد ادب کے اندر رہتے ہوئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ بدقسمتی سے ایسے ادوار بھی آئے ہیں جب ان کی عقل و دانش کا واضح مظاہرہ نہیں ہوا۔ اور عجب تر

بات یہ ہے کہ یہی وہ ادوار تھے جن میں انہیں بے پناہ اقتدار حاصل تھا۔

ایمان و یقین کا عہد وہ تھا (جس کی تعریف کرتے ہوئے نومتکلمین نہیں تھکتے) کہ جس میں پیران کلیسا کو کلی اختیارات حاصل تھے۔ روز مرہ کی زندگی میں ولیوں کے استدراجات کی بھرمار تھی اور ساتھ ہی ساتھ شیاطین اور جادوگروں کے ہتھکنڈے بھی مستقلاً اپنا کام دکھا رہے تھے۔ انسان کے گناہوں کی سزا' وبا' قحط سالی' زلزلوں' طوفانوں اور آتش زدگی کی صورت میں نازل ہوتی تھی۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ اس تادیب کے باوجود اس عہد کے لوگ آج کے مقابلے میں زیادہ مائل بہ گناہ تھے۔ دنیا کے متعلق سائنسی سطح پر بہت کم معلومات حاصل تھیں۔ کچھ عالم لوگوں کو البتہ یونانی فلسفیوں کے اس نظریہ کا علم تھا کہ زمین گول ہے۔ تاہم اکثر لوگ اس خیال کا تمسخر اڑاتے تھے کہ کرہ ارض کی دوسری طرف بھی موجود ہے۔ اور یہ کہ دوسری طرف بھی انسانی آبادی ہے۔ اسے الحاد و زندقہ قرار دیا جاتا تھا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسانوں کی اکثریت ازلی لعنت کا شکار ہے، (اگرچہ اب کیتھولک فرقے نے اس باب میں کچھ نرمی اختیار کرلی ہے) ہر موڑ پر خطرات انسان کی گھات میں لگے رہتے تھے۔ راہبوں کے استعمال میں آنے والی خوراک میں شیطانی اثرات سرایت کر جاتے تھے۔ اور بے خبری میں ان لوگوں کے جسم میں حلول کر جاتے تھے جو ہر لقمے سے پہلے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانے کے متعلق محتاط نہیں ہوتے تھے۔ پرانی وضع کے لوگوں کے سامنے آج بھی کوئی چھینکے تو کہتے ہیں اللہ تم پر رحم کرے۔ اگرچہ اس رسم کی معنویت سے ناواقف ہیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ چھینک کے ساتھ انسان کی روح باہر نکل آتی ہے۔ اور روح کی واپسی سے پہلے گھات میں بیٹھے ہوئے شیاطین چھینکنے والے کے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص پاس سے یہ کہہ دے کہ اللہ تم پر رحم کرے تو شیاطین ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

گزشتہ چار صدیوں کے دوران جن میں سائنس نے ترقی کی ہے اور انسان کو قوانین فطرت کا علم اور فطری قوتوں پر غلبہ و اختیار بخشا ہے' پیران کلیسا سائنس کے خلاف ایک ناکام جنگ میں مصروف رہے ہیں۔ طبقات الارض' تشریح الابدان' عضویات' حیاتیات' نفسیات اور عمرانیات ہر میدان میں انہیں جب ایک مقام پر ہزیمت اٹھانا پڑتی ہے تو وہ کوئی اور سہارا ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ فلکیات میں شکست خوردگی کے بعد انہوں نے طبقات الارض

کے علم کے پھیلاؤ کو روکنے کی کوشش کی۔ حیاتیات میں ڈارون کے خلاف جنگ لڑی اور فی زمانہ وہ نفسیات اور تعلیم کے میدان میں سائنسی نظریوں کے خلاف کمربستہ ہیں۔ ہر موقعہ پر وہ کوشش کرتے ہیں کہ عوام ان کی گزشتہ رجعت پسندی کو بھول جائیں۔ تاکہ ان کی موجودہ رجعت پسندی پر پردہ پڑا رہے۔ سائنس کے زمانہ عروج کے بعد سے پیران کلیسا کی بعض بوالعجبیوں کا ہم یہاں جائزہ لیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھیں گے کہ دوسرے لوگوں کے ہاں اصلاح احوال کی کیا صورت ہے۔

جب بنجمن فرینکلن نے آسمانی بجلی سے بچاؤ کے لئے برق کش ایجاد کیا تو اہل کلیسا نے انگلینڈ اور امریکہ دونوں جگہ اس کی اس بنا پر مخالفت کی کہ یہ خدائی ارادے کو شکست دینے کی ناروا جسارت ہے۔ اور اس ضمن میں انہیں جارج سوم کی عملی حمایت حاصل تھی۔ تمام صحیح العقیدہ لوگ یہ جانتے تھے کہ خدا آسمانی بجلی کو اس لئے نازل کرتا ہے کہ اس سے بدکاری کی سزا مقصود ہوتی ہے یا کسی اور گناہ کی تادیب۔ نیک لوگوں پر بجلی کبھی نہیں گرائی جاتی۔ چنانچہ بنجمن فرینکلن کے لئے یہ روا نہیں تھا کہ خدائی نظام میں مداخلت کرتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس طرح وہ مجرموں کو بچ نکلنے میں مدد دے رہا تھا۔ تاہم اگر ہم بوسٹن کے رہنما بزرگ تر ڈاکٹر پرائس کی بات مان لیں تو خدا کے ہاں اس کا توڑ موجود تھا۔ کیونکہ جب ڈاکٹر فرینکلن کے ایجاد کردہ آہنی نوکدار تنصیبات نے آسمانی بجلی کو غیر موثر کر دیا تو خدا نے میسا چوسٹس کو زلزلوں سے ہلا کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر پرائس کا خیال تھا کہ ''آہنی سلاخوں'' پر خدا نے یوں اپنا عذاب نازل کیا تھا۔ اپنے ایک وعظ میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ''بوسٹن میں' نیوانگلینڈ کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں ان کی بہتات تھی۔ اور اسی لئے بوسٹن زیادہ خوفناک طور پر زلزلے سے متاثر ہوا۔ سچ ہے خدا کی قدرت سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔'' تاہم ظاہر یہ ہوتا ہے کہ قدرت خداوندی نے بوسٹن کو اس کے شر پر تادیب کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ اگرچہ ''بجلی کی سلاخیں'' نصب ہوتی رہیں' تاہم میسا چوسٹس میں زلزلے بہت کم آتے ہیں۔ بایں ہمہ ڈاکٹر پرائس کی رائے یا اس سے ملتے جلتے خیالات اب بھی زمانہ حال کے ایک انتہائی اثر و رسوخ کے حامل شخص کے ہاں موجود ہیں۔ ایک موقعہ پر جب ہندوستان میں پے در پے تباہ کن زلزلے آئے تو مہاتما گاندھی نے کمال سنجیدگی سے لوگوں کو متنبہ کیا کہ یہ زلزلے ان کے گناہوں کی سزا کے

طور پر نازل ہوئے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ میرے اپنے جزیرے میں بھی یہ نکتہ نظر رائج ہے۔18-1914ء کی جنگ کے دوران حکومت نے مقامی طور پر خوراک کی ضرورت پوری کرنے کے لئے بہت کوششیں کی تھیں۔ لیکن 1916ء میں جب حالات ٹھیک نہیں جا رہے تھے تو سکاٹ لینڈ کے ایک پادری نے اخبارات میں لکھا کہ فوجی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی ایماء پر آلوؤں کی کاشت سبت کے دن بھی جاری رہی تھی۔ تاہم بلا ٹل گئی۔ اس وجہ سے کہ جرمنوں نے ایک چھوڑ، پورے اوامر عشرہ کی خلاف ورزی کر ڈالی۔

اگر اللہ کے نیک بندوں کی باتوں کا یقین کر لیا جائے تو بعض اوقات اکرام خداوندی میں ایک عجیب طرح کی انتخابیت کارفرما ہوتی ہے۔ ''راک آف ایجز'' Rock of Ages کے مصنف ٹاپ لیڈی Toplady نے ایک دفعہ ایک حلقہ سے دوسرے میں نقل مکانی کر لی۔ اس نقل مکانی کے ایک ہفتہ بعد وہ عمارت جس میں وہ رہائش پذیر تھا، جل گئی۔ جس سے اس کی جگہ آنے والے ''پادری'' کا بہت نقصان ہوا۔ اس پر ٹاپ لیدی نے خدا کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن نئے ''پادری'' نے کیا کہا اس کا ہمیں علم نہیں ''بائبل ان سپین'' Bible in Sapin کے مصنف ''بارڈ'' نے بیان کیا ہے کہ اس نے ایسے درے کو بخیریت عبور کر لیا جو ڈاکوؤں اور لٹیروں کی آماج گاہ تھا۔ اس کے بعد آنے والے قافلے کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور بعض مسافروں کو قتل کر ڈالا۔ ظاہر ہے اس موقعہ پر ''ٹاپ لیڈی'' کی طرح ''بارڈ'' نے بھی خدا کا شکر ادا کیا ہو گا۔

درسی کتابوں میں اگرچہ ہمیں کوپرنیکس کی فلکیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تاہم یہ تعلیمات ہمارے مذہب یا اخلاق کا حصہ نہیں بن سکیں۔ انہوں نے علم نجوم پر ہمارے ایمان کو بھی متزلزل نہیں کیا۔ لوگ اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ خدائی نظام انسانوں کے حوالے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ قدرت کی خاص طاقتیں نہ صرف یہ کہ نیکی کی حفاظت کرتی ہیں، بلکہ شر کو سزا بھی دیتی ہیں۔ میں بعض اوقات ان لوگوں کے الحاد پر بہت افسردہ ہو جاتا ہوں جو اپنے آپ کو بہت زیادہ پرہیزگار سمجھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ راہبہ خواتین کبھی نہانے کا لباس پہنے بغیر غسل نہیں کر سکتیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ وہ ایسا کریں کرتی ہیں کیونکہ کوئی مرد تو انہیں دیکھ نہیں رہا ہوتا تو ان کا جواب ہو گا ''لیکن تم خدا کو کیوں بھول جاتے ہو۔'' یوں لگتا ہے

جیسے ان کے ہاں معبود کا تصور تاک جھانک کرنے والے ''پیپنگ ٹام'' Peeping Tom کی طرح ہے۔ جس کی ہر جگہ موجودگی غسل خانے کی دیواروں کے آر پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن غسل کے لباس کے اندر نہیں جھانک سکتی۔ یہ بات مجھے ہمیشہ بہت عجیب لگتی ہے۔

''گناہ'' کا تمام تر تصور مرے لئے پریشان کن رہا ہے۔ اس لئے بھی کہ میں ایک گناہگار شخص ہوں۔ اگر تو گناہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے بلاوجہ تکلیف پہنچتی ہے تو بات میری سمجھ میں آ جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ گناہ بعض اوقات غیر ضروری تکلیف کا سدباب کر دیتا ہے۔ کچھ عرصے کی بات ہے کہ برطانوی دار الامراء میں ایک قانون کا مسودہ پیش کیا گیا جس کی رو سے ناقابل علاج اور انتہائی تکلیف دہ امراض کی صورت میں مریض کی موت کو جائز قرار دیا جانا مقصود تھا تاہم اس کارروائی سے پہلے مریض کی رضامندی اور طبی آراء کا حصول لازمی قرار دیا گیا تھا۔ میں اپنی سادہ لوحی کے باعث یہ سمجھتا ہوں کہ مریض کی رضامندی بہرحال ضروری ہے۔ لیکن سابق ''آرچ بشپ آف کنٹربری'' جس کی رائے سرکاری طور پر ''گناہ'' کے معاملے میں حتمی مانی جاتی ہے' نے میری رائے کو غلط قرار دیا۔ کیونکہ ان کی رائے میں مریض کی رضامندی ''موت بر بنائے رحم'' کو خودکشی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ دارالامراء کے اراکین نے اس مقتدر دلیل کو سنا اور مسودہ قانون کو رد کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آرچ بشپ اور خدا کی خوشنودی کے لئے کینسر کے لاعلاج مریضوں کو مہینوں تک قطعی طور پر بے مصرف اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے معالج اور نرسیں قتل عمد کا الزام اپنے سر لینے پر تیار ہو جائیں۔ میرے لئے ایک ایسے خدا کا تصور محال ہے جو اس قسم کی ایذا دہی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور اگر بالفعل کوئی ایسا خدا موجود ہے جو اس قسم کے لاابالی ظلم و تعدی کو روا رکھتا ہے تو میں اسے عبادت کے لائق نہیں سمجھتا۔ لیکن اس سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ میں کس حد تک اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوں۔

اسی طرح گناہ و ثواب کی تمیز بھی میرے لئے پریشان کن ہے۔ جب جانوروں پر انسداد بے رحمی کی انجمن نے پوپ سے استمداد کی درخواست کی تو اس نے انکار کر دیا کیونکہ انسان پر نچلے درجے کے حیوانات کے لئے کسی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس لئے

کہ حیوانات ذی روح مخلوق نہیں ہیں۔ یونہی سہی لیکن اپنی سابقہ فوت شدہ بیوی کی بہن سے شادی کیوں ناجائز ہے۔ (کلیسا کی تعلیم یہی ہے) خواہ دونوں میں اس کے لئے شدید خواہش موجود ہو۔ یہ مسئلہ کسی ایسی سوچ پر مشتمل نہیں ہے کہ اس رشتے سے کسی فریق کی دل آزاری ہو گی۔ بلکہ ایسا یوں ہے کہ کتاب میں یہی لکھا ہے۔

حشر اجساد جو روایتی عیسائی مذہب کا ایک عقیدہ ہے' ایک ایسا اذعانی مسئلہ ہے' جس کے نتائج محیر العقول ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ایک مصنف نے دنیا کے اختتام کی تاریخ کے تعین کا طریقہ اختراع کیا تھا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ انسانی جسم کے اعضائے رئیسہ کے اتنے اجزاء یقیناً موجود ہیں۔ جو روز آخرت تک ہر ایک فرد کے ئے کفالت کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام موجود اور دستیاب کام اجزاء کی بنا پر اس نے حساب لگایا تھا کہ یہ سب کے سب اجزاء ایک خاص تاریخ تک استعمال ہو چکے ہوں گے۔ اور جب یہ تاریخ آئے گی تو دنیا لازماً ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ اگر یوں نہ ہوا تو پھر حشر اجساد ممکن نہیں ہو گا۔ بدقسمتی سے صحیح تاریخ جو اس نے مقرر کی تھی' یاد نہیں رہی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ زیادہ بعید دور کی تاریخ نہیں تھی۔

سینٹ طامس ایکوناس نے جسے کیتھولک کلیسا کے نمائندہ فلسفی کی حیثیت حاصل ہے' ایک اہم مسئلہ کا بڑی سنجیدگی سے بالتفصیل جائزہ لیا ہے جسے آج کے ماہرین الہیات ناروا طور پر نظر انداز کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے آدم خور کا ذکر کرتا ہے جس نے انسانی گوشت کے سوا کبھی کچھ نہیں چکھا تھا۔ اس کے والدین کی خصوصیت بھی یہی تھی۔ چنانچہ اس کے جسم کا ہر ذرہ دراصل کسی اور کے وجود کا حصہ تھا۔ یہ تو فرض نہیں کیا جا سکتا کہ جنہیں آدم خور ہضم کر گئے ہیں وہ ابدالاباد میں ناپید ہی رہیں گے۔ لیکن اگر یوں نہیں تو پھر جب اس کے جسم کے اجزاء کو اصل اجسام پر لوٹا دیا جائے گا تو دوزخ میں اسے کس طرح جلایا جا سکے گا۔ جیسا کہ موصوف نے بیان کیا ہے یہ واقعی ایک پریشان کن مسئلہ ہے۔

اس ضمن میں قدامت پسندوں کا میت کو جلانے کے خلاف اعتراض عجیب نوعیت کا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں خدا کی قدرت کاملہ پر کافی یقین نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے جس لاش کو جلا دیا جائے اس کے اجزاء کو متحد کرنا اس لاش کے مقابلے میں مشکل ہو گا۔ جسے دفن کیا گیا ہو۔ یہ بات درست ہے کہ ہوا میں منتشر اجزاء کو اکٹھا کرنا اور احتراق

(جلنے) کے کیمیاوی عمل کا توڑ زیادہ محنت طلب ہے۔ تاہم یہ فرض کر لینا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے یقیناً بدعقیدگی کا مظہر ہے۔ چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لاش جلانے کے خلاف ردعمل شاید الحاد و زندقہ ہے۔ تاہم مجھے شک ہے کہ میری اس رائے کو قدامت پسند اہمیت دیں گے۔

طبی علم کی ضرورت کے لئے لاشوں کی چیر پھاڑ کی کلیسا نے بہت دیر سے اور بہت سوچ بچار کے بعد اجازت دی تھی۔ اس ضمن میں اہم کردار دسالیس نے ادا کیا جو شہنشاہ چارلس پنجم کا درباری طبیب تھا۔ اس کی طبی مہارت کی بنا پر شہنشاہ اس کی حفاظت کرتا رہا۔ لیکن بادشاہ کی وفات پر اسے مشکل سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک لاش میں جس پر وہ عمل کر رہا تھا' نشتر زنی کے دوران زندگی کے آثار ظاہر ہوئے جس پر اسے قتل عمد کا مرتکب قرار دیا گیا۔ مذہبی عدالت کو بادشاہ فلپ ثانی نے نرمی برتنے پر مائل کیا چنانچہ اسے صرف یہ سزا دی گئی کہ وہ ارض مقدس کی زیارت کا فریضہ ادا کرے۔ واپسی پر اس کے جہاز کو حادثہ پیش آ گیا اور وہ فوت ہو گیا۔ اس واقعہ کے صدیوں بعد تک بھی پاپائے روم کی یونیورسٹی میں طلبہ کو صرف مصنوعی اجسام پر جن میں جنسی اعضاء بھی نہیں ہوتے تھے' عمل جراحی کی اجازت تھی۔

لاش کا تقدس ایک عام عقیدہ ہے۔ اسے مصریوں نے اور بھی تقویت پہنچائی جن کے ہاں اس عقیدے نے لاشوں کو حنوط کرنے کی رسم کو رواج دیا۔ چین میں یہ آج بھی پوری شد و مد کے ساتھ رائج ہے۔ ایک فرانسیسی جراح' جس کی خدمات چینیوں نے مغربی طب کی تعلیم و تدریس کے لئے حاصل کی تھیں' بیان کرتا ہے کہ جب اس نے عمل جراحی کے لئے لاشیں مہیا کرنے کے لئے کہا تو اس پر شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ تاہم اسے یہ پیشکش کی گئی کہ لاشوں کی بجائے اسے زندہ مجرم جتنی تعداد میں وہ چاہے' مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ اس متبادل پیشکش کے خلاف فرانسیسی ڈاکٹر کے اعتراضات اس کے چینی آجروں کے لئے قطعاً ناقابل فہم تھے۔

اگرچہ گناہوں کی بہت سی اقسام ہیں۔ تاہم ان میں سے سات گناہ کبیرہ شمار ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے بھی شیطانی ہتھکنڈوں کے لئے جنس سب سے زیادہ بارآور میدان ثابت ہوتا ہے۔ اس موضوع پر کیتھولک فرقہ کا راسخ عقیدہ سینٹ پال' سینٹ آگسٹائن اور سینٹ اکیوناس کے ہاں ملتا ہے۔ سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ انسان تجرد کی زندگی بسر

کرے۔ لیکن جنہیں اس حد تک ضبط نفس کی توفیق ارزانی نہ ہوئی ہو' ان کے لئے جائز ہے کہ شادی کر لیں۔ لیکن شادی کی حالت میں بھی مباشرت صرف اس صورت میں گناہ نہیں ہو گی جب مقصد اولاد کا حصول ہو' نکاح کے بغیر ہر قسم کا تعلق صریحاً گناہ ہے۔ لیکن شادی میں بھی اگر مانع حمل ذرائع استعمال کئے جائیں تو مباشرت گناہ ہے۔ اسقاط حمل بھی گناہ ہے۔ اگرچہ طبی مشورے کے مطابق ماں کی زندگی بچانے کی یہی ایک صورت ہو۔ کیونکہ طبی رائے غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اور خدا اگر چاہے تو کسی معجزے کے ذریعے زندگی بخش سکتا ہے۔ (یہ رائے قانون (Connecticup) میں درج ہے) جنسی امراض' گناہ گار کے لئے خدا کی مقرر کردہ سزا ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ایک گناہگار خاوند کے ذریعے یہ سزا ایک معصوم عورت اور ان کے بچوں کا مقدر بھی بن سکتی ہے۔ تاہم یہ تقدیر الٰہی کا ایک اسرار ہے۔ جس کے خلاف زبان کھولنا ناروا ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں پوچھنا چاہئے کہ کولمبس کے عہد سے پیشتر جنسی امراض تقدیر الٰہی میں کیوں شامل نہیں تھے۔ چونکہ یہ گناہ کی مقرر کردہ سزا ہیں' لہٰذا ان سے بچ نکلنے کے تمام طریقہ ہائے کار ماسوائے پرہیز گاری' بھی گناہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ شادی صرف برائے نام ناقابل تنسیخ ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ جو بظاہر شادی کے بندھن میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں' اس حکم کو قبول نہیں کرتے۔ کیتھولک فرقے کے بااثر لوگ تنسیخ کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ لیکن غریب غربا کے لئے ایسی کوئی سبیل موجود نہیں سوائے نامردی کے۔ جو لوگ ایک بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوبارہ شادی کر لیتے ہیں وہ خدا کی نظر میں زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔

''خدا کی نظروں میں'' یہ ترکیب مجھے ہمیشہ الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ خدا ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ غلط بیانی ہے۔ وہ Reno کو نہیں دیکھتا کیونکہ کسی کو ''خدا کی نظروں کے سامنے'' طلاق نہیں دی جا سکتی۔ نکاح رجسٹرار کا دفتر ایک اور مشکوک مقام ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ معزز لوگ جو کسی ایسے شخص سے میل ملاپ روا نہیں رکھتے جو کھلم کھلا گناہ کا مرتکب ہوتا ہو وہ ان لوگوں سے ملنے میں قباحت محسوس نہیں کرتے جنہوں نے صرف ''سول میرج'' (عدالتی شادی) کی ہو۔ چنانچہ یہ ماننا پڑے گا کہ نکاح رجسٹرار کے دفتر کی کارروائی بھی ''خدا کی نظروں'' کے سامنے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ تو پھر یہ ناجائز تو نہ ہوئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کیتھولک کلیسا کے قوانین، جنس کے معاملے میں قابل افسوس حد تک نرم ہیں۔ ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی نے اپنی آخری عمر میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ جنسی تعلق ہر حال میں ''حرام'' ہے۔ شادی میں بھی اور بچے حاصل کرنے کے لئے بھی۔ مانی چیون بھی اسی نظریئے کے حامل ہیں۔ تاہم انسانوں کی فطری گناہگاری کے باعث وہ مطمئن تھے کہ انہیں وقفے وقفے سے شاگردوں کی نئی پود میسر آتی رہے گی۔ بہرحال یہ نظریہ گمراہ کن ہے۔ اور اس کے برعکس یہ سوچنا بھی اتنا ہی گمراہ کن ہے کہ شادی بیاہ تجرد ہی کی طرح قابل تعریف ہے۔ ٹالسٹائی کے نزدیک تمباکو نوشی بھی جنس ہی کی طرح کا گناہ ہے، اس کے ایک ناول میں ایک کردار جو قتل کا منصوبہ بنا رہا ہے، سگریٹ پینے لگتا ہے۔ تاکہ اس کے اندر قاتلانہ جوش وخروش پیدا ہو سکے۔ تاہم تمباکو پر صحیفوں میں پابندی عائد نہیں کی گئی۔ لیکن جیسے کہ سیموئل بٹلر نے کہا ہے اگر یہ چیز سینٹ پال کے علم میں آتی تو وہ یقیناً اسے ناجائز قرار دیتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ کلیسا اور رائے عامہ ایک حد کے اندر بوس وکنار کو جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن گناہ کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے متعلق فقیہوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک برگزیدہ راسخ العقیدہ کیتھولک بزرگ نے تو یہاں تک اجازت دے دی ہے کہ اعتراف گناہ کے لئے آنے والا شخص کسی راہبہ کی چھاتیوں کو چھو سکتا ہے بشرطیکہ اس کی نیت نیک ہو۔ تاہم مجھے شک ہے کہ موجودہ دور کے صاحبان اختیار اس نکتہ پر اس سے متفق ہوں۔

موجودہ دور کا اخلاق دو اجزاء پر مشتمل ہے ایک تو وہ عقلی تصورات ہیں کہ ایک معاشرے میں کس طرح امن چین کے ساتھ رہنا چاہئے۔ دوسری طرف وہ روایتی محرمات ہیں جو بنیادی طور پر تو کسی قدیم توہم پر مبنی ہیں لیکن بظاہر مسلمانوں، عیسائیوں، ہندوؤں اور بدھوں کے مقدس صحیفوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ کسی حد تک دونوں میں باہم مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً قتل اور چوری پر پابندی کی انسانی عقل اور احکام الٰہی دونوں حمایت کرتے ہیں۔ لیکن سود یا گائے کے گوشت کی حرمت اور وہ بھی مخصوص مذاہب میں، صرف حکم خداوندی کا نتیجہ ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ موجودہ عہد میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ سائنس نے علم کی ترقی اور سماجی زندگی کے حالات بدلنے میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ لوگ

صحیفوں کے احکام ماننے پر تیار ہیں۔ جو بہت پرانے زمانے کے جاہلانہ دیہاتی' زرعی قبیلوں کے طرز فکر کے حامل ہیں۔ یہ حوصلہ شکن حقیقت ہے کہ وہ مقولے جن کا تقدس جرح و تعدیل کے بغیر قبول کر لیا جاتا ہے' وہ سر تا سر غیر ضروری مصائب کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔ اگر انسانوں میں رواداری موجود ہو تو وہ کچھ ایسے طریقے ڈھونڈ نکالیں گے جن سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ ان مقولوں کو ان کے لفظی معنوں میں قبول نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً یہ مقولہ کہ ''تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے اسے بیچ ڈالو۔ اور یوں جو کچھ ہاتھ آئے وہ غریبوں میں بانٹ دو۔''

گناہ کے تصور میں کچھ منطقی گھپلے ہیں۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ گناہ خدائی احکام کی نافرمانی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ خدا قادر مطلق ہے۔ اگر یوں ہے تو پھر کوئی کام اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب کوئی گناہگار اس کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے تو ظاہر ہے اس کی مرضی ہی سے ہوتا ہے۔ سینٹ آگسٹائین اس بات کا جرات کے ساتھ اقرار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان گناہ پر اس لئے مائل ہوتے ہیں کہ خدا ان پر ایک اندھا پن مسلط کر دیتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں بہت سے الہیات کے علماء محسوس کرتے ہیں کہ اگر خدا انسانوں کو گناہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے تو پھر انہیں اس چیز پر دوزخ میں دھکیل دینا قرین انصاف نہیں۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ گناہ خدا کی مرضی کے خلاف عمل کا نام ہے۔ اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو لوگ سپنوزا کی طرح سنجیدگی سے خدا کی قدرت کاملہ کے معتقد ہیں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گناہ کا کوئی وجود نہیں ہے، اس کا نتیجہ خوف ناک ہوتا ہے چنانچہ سپنوزا کے ہم عصروں نے جواب دیا کہ نیرو کا اپنی ماں کو قتل کر دینا گناہ نہیں تو کیا تھا؟ کیا آدم کا سیب کھا لینا گناہ نہیں تھا؟ سپنوزا کوشش کرتا ہے۔ لیکن اسے کوئی مناسب حل نہیں ملتا۔ اگرچہ ہر چیز خدا کی مرضی پر منحصر ہے تو پھر خدا نے یہ بھی چاہا ہوگا کہ نیرو اپنی ماں کو قتل کر دے۔ اگر خدا خیر محض ہے تو یہ قتل بھی خیر ہی کی قبیل سے ہوگا۔ اس دلیل سے فرار کی کوئی صورت نہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ خدا کی نافرمانی کا نام ہے' تو انہیں مجبوراً یہ ماننا پڑتا ہے کہ خدا قادر مطلق نہیں ہے۔ ساری منطقی الجھنوں کا یہی ایک حل ہے اور الہیات کے آزاد خیال مکتب کی رائے یہی ہے۔ تاہم یہاں بھی کچھ دقتیں ہیں۔ ہم یہ کیسے جان سکتے

ہیں کہ خدا کی اصلی مرضی کیا ہے؟ اگر شر کی قوتوں کو بھی کچھ قدرت یا اختیار حاصل ہے' تو یہ ہوسکتا ہے وہ ہمیں دھوکے سے اس چیز کو کتاب الٰہی مان لینے پر مائل کر لیں جو دراصل ان کی اپنی کارستانی ہے۔ غناسطیت کا مسلک یہی ہے جنہوں نے یہ قرار دیا تھا کہ عہد نامہ قدیم دراصل کسی بدروح کا کارنامہ ہے۔

جونہی ہم عقل کو خیر باد کہتے ہیں اور سند پر تکیہ کرنے لگتے ہیں تو ہماری مشکلات بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ آخر کس صحیفے کو مستند مانا جائے' عہد نامہ جدید یا قرآن؟ اصل میں لوگ اس کتاب کو مان لیتے ہیں جو اس معاشرے میں مقدس سمجھی جاتی ہے' جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں سے بھی وہ اپنی پسند کے حصوں کو مانتے ہیں باقی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک وقت میں انجیل کا سب سے موثر فرمان یہ تھا کہ ''تم کسی جادوگرنی کا وجود برداشت نہیں کرو گے۔'' آج کل لوگ اس فرمان کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کبھی خاموشی سے کبھی کوئی عذر تراش کر۔ چنانچہ جب ہمارے ہاں ایک مقدس صحیفہ ہو تو اس وقت بھی ہم صرف ان چیزوں کو صحیح مانتے ہیں جو ہمارے تعصّبات سے ہم آہنگ ہوں۔ آج کوئی کیتھولک اس حکم پر سنجیدگی سے عمل پیرا نہیں کہ ایک بشپ (پادری) صرف ایک بیوی رکھ سکتا ہے۔

عوام کے تیقن کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ عقیدے کے لئے کوئی ثبوت یا جواز موجود ہوتا ہے۔ اس قسم کا تیقن روز مرہ کے معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص کے ٹیلیفون کا نمبر کیا ہے؟ یا عالمی مقابلہ کس نے جیتا؟ لیکن جب معاملہ بڑھ کر ایسی صورت حال تک پہنچتا ہے' جس میں نزاع کی گنجائش ہو تو تیقن کے اسباب کا اثبات مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارا پہلا اعتبار تو وہ ہوتا ہے جو ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ ہم کتنے اچھے ہیں۔ حضرت انسان کا معدہ اگر ٹھیک کام کر رہا ہو' اور آمدنی بھی معقول ہو تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اپنے فلاں ہمسائے کی نسبت زیادہ سمجھدار ہیں جس نے ایک خبطی عورت سے شادی کی ہے۔ اور جسے کاروبار میں ہمیشہ گھاٹا پڑتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کا شہر 150 میل دور دراز کے شہروں سے بدرجہا بہتر ہے کہ یہاں جو چیمبرز آف کامرس ہے، وہ بہت بڑا ادارہ ہے۔ اور یہاں کی روٹری کلب بھی زیادہ فعال ہے۔ یہاں تک کہ اس شہر کے سربراہ کو کبھی جیل کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔ بڑھتے بڑھتے وہ یہاں تک پہنچتے ہیں کہ

ان کا ملک دوسرے تمام ممالک پر برتری کا حامل ہے۔ اگر وہ انگریز ہے تو اپنی عظمت کو شیکسپیر، ملٹن یانیوٹن اور ڈارون یا پھر نیلسن اور ونگٹن سے اپنی افتادطبع کے مطابق وابستہ کر دیتا ہے۔ اگر وہ فرانسیسی ہے تو اپنے آپ کو قابل مبارکباد سمجھتا ہے کہ اس کے ملک نے صدیوں تک تہذیب و ثقافت، فیشن اور طباخی میں دنیا کی رہبری کی ہے۔ روسی ہو تو اس بات پر فخر کرتا ہے کہ اس کا ملک حقیقی معنوں میں بین الاقوامیت کا حامل ہے۔ اگر وہ یوگوسلاویہ کا باشندہ ہے تو وہ اپنے ملک کی خام دھاتوں پر فخر کرتا ہے۔ مناکو کا باشندہ ہو تو اس کے لئے قابل فخر بات یہ ہے کہ اس کا شہر قمار بازی کا مرکز ہے۔

لیکن یہ وہ باتیں نہیں ہیں جن کے لئے وہ اپنے آپ کو قابل مبارکباد سمجھتا ہے۔ کیا وہ اس نوع کا فرد نہیں ہے جو انسان کہلاتی ہے۔ عام حیوانات میں صرف اس کی نوع لافانی روح کی حامل ہے۔ وہ عاقل ہے، وہ خیر و شر میں تمیز کر سکتا ہے۔ ضرب و تقسیم کے قاعدوں کو سمجھتا ہے۔ یہ وہی تو ہے جسے خدا نے خاص اپنی شبیہ پر تخلیق کیا تھا۔ کیا ہر چیز انسان کی سہولت کے لئے نہیں بنائی گئی۔ سورج اس کے دن کو روشن کرتا ہے۔ چاند اس کی راتوں میں نور پھیلاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ فطرت کی کسی بھول چوک کے باعث رات کے آدھے لمحات ہی کو روشن کر سکتا ہے۔ زمین سے اگنے والے تازہ پھل انسان کی خوراک کا کام دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ماہرین الٰہیات کے نزدیک خرگوش کی سفید دم بھی ایک مقصد رکھتی ہے، کہ اس کے باعث شکاریوں کو اس کے شکار میں سہولت ہوتی ہے۔ یہ بجا ہے کہ کچھ مصائب بھی ہیں۔ شیر اور چیتے بہت خونخوار ہیں، موسم گرما میں بہت گرمی پڑتی ہے۔ اور موسم سرما میں سردی کی شدت ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب باتیں تو تب سے شروع ہوئیں جب آدم نے شجر ممنوعہ کا پھل چکھا تھا۔ اس سے پہلے تمام جانور سبزی خور تھے۔ اور موسم ہمیشہ بہار آفریں ہوتا تھا۔ اگر آدم نے شفتالو، ناشپاتی، آڑو اور انگور اور انناس پر صبر کر لیا ہوتا تو زندگی میں بس خیر و برکت ہی ہوتی۔

خود پسندی، انفرادی یا نوعی ہمارے بہت سے مذہبی عقائد کا سبب بنتی ہے۔ حتیٰ کہ گناہ کا تصور بھی اسی خود پسندی کی پیداوار ہے۔ بارو(Borrow) بیان کرتا ہے کہ اسے ویلز کے ایک پادری سے ملاقات کا موقع ملا۔ جو ہمیشہ افسردہ خاطر رہتا تھا۔ ہمدردانہ پوچھ گچھ پر اس نے بتایا کہ سات سال کی عمر میں اس نے مقدس روح کی شان میں گستاخی کی تھی۔ چنانچہ

بارو نے اس سے کہا کہ عزیز من اس بات پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' میں درجنوں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اس کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ اپنے آپ کو صرف اس بنا پر دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ نہ سمجھو۔ اگر تم تحقیق کرو تو تمہیں بے شمار ایسے لوگ ملیں گے۔ اس کے بعد اس کی حالت بہتر ہوگئی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی انفرادیت اس کے لئے طمانیت کا باعث تھی۔ اور گناہگاروں کی بھیڑ میں گم ہو جانے میں کوئی لطف نہیں تھا۔ تاہم ماہرین الٰہیات کے لیے یقیناً یہ بات بہت معنی رکھتی ہے کہ صرف انسان ہی غضب خداوندی کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اس کی شفقت کا مستحق بھی صرف وہی ہے۔ چنانچہ ہبوط آدم کے بعد کی کیفیت کا نقشہ ملٹن نے اس طرح پیش کیا ہے:

''سورج نے پہلے پہل گردش کی اور تب و تاب پائی کہ زمین کو گرمی اور سردی کی شدت سے آشنا کر دے۔ شمال سے مفلوج کر دینے والی سردی اور جنوب سے حرارت کو کھینچ لائے۔''

نتائج کتنے بھی تکلیف دہ رہے ہوں' انسان نے اس امر پر یقیناً فخر محسوس کیا ہوگا کہ عناصر کا یہ عظیم نظام صرف اسے سبق سکھانے کے لئے تشکیل دیا گیا۔ دوزخ اور جنت کے باب میں الٰہیات کا تمام دفاتر کی تہ میں یہ رمز کارفرما ہے کہ کائنات میں انسان کو جملہ مخلوقات کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اور چونکہ تمام ماہرین الٰہیات نوع انسان سے تعلق رکھتے ہیں' اس لئے اس مفروضے کو زیادہ مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

جب سے نظریہ ارتقاء کو فروغ حاصل ہوا ہے' عظمت انسانی نے ایک اور روپ دھار لیا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ سلسلہ ارتقاء کا ایک عظیم مقصد تھا۔ دلدلوں' حجری مخلوق' ڈینو سار' اور بڑے قد کی تھوہر' شہد کی مکھیوں اور جنگلی پھولوں کے دور سے مشیت بتدریج منتہائے کمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بالآخر جب موزوں لمحہ آن پہنچا تو انسان وجود میں آیا۔ اس نوع میں نیرو' کالی گیولا' ہٹلر اور مسولینی جیسے عجوبے بھی شامل تھے۔ جن کی ماورائی عظمت گویا طویل صبر آزما تخلیقی عمل کا جواز تھی۔ میرے نزدیک تو ابدی لعنت کا تصور بھی اس ناکارہ اور ہیچ حاصل کے مقابلے میں کچھ کچھ قابل قبول اور کم مضحکہ خیز ہے۔ جس کے متعلق ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یہ قدرت کاملہ کا بہترین اظہار ہے۔

خدا یقیناً قادر مطلق ہے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر مقصود مشیت یہی تھا تو

پھر اس کے لئے اتنی طویل صبر آزما تمہید کی کیا ضرورت تھی۔

اس سوال سے قطع نظر کہ انسان کیا واقعی اتنی ہی شاندار مخلوق ہے' جتنا ارتقاء کے ماہرین اسے ظاہر کرتے ہیں۔ ایک اور مشکل یہ ہے کہ اس کرہ ارض پر زندگی یقیناً عارضی ہے۔ زمین آہستہ آہستہ سرد ہوتی چلی جائے گی۔ یا کرہ ہوائی بالآخر تحلیل ہو جائے گا۔ یا پانی کی قلت پیدا ہو جائے گی۔ یا جیسے سر جیمز جینز نے پیش گوئی کی ہے' سورج پھٹ جائے گا اور تمام سیارے گیس میں تبدیل ہو جائیں گے۔ ان میں سے کون سا حادثہ پہلے رونما ہوتا ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ نوع انسان بالآخر فنا ہو جائے گی۔ یہ معاملہ قدامت پسند الہیات کے نکتہ نظر سے کچھ زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔ کیونکہ انسان بہرحال ''فانی'' ہے۔ کیونکہ جب زمین پر اس کا نام ونشان مٹ جائے گا تو پھر وہ جنت اور دوزخ میں آباد ہو جائے گا۔ اگر یوں ہے تو پھر فضائی تبدیلیوں کا ڈر کیسا؟ جو لوگ ابتدائی دلدلی دور سے انسان تک کے ارتقاء پر زور دیتے ہیں' وہ اس ارضی ماحول سے ایک خاص اہمیت وابستہ کر دیتے ہیں جو انہیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس زمین پر زندگی کو ایک مختصر ترین وقفہ سمجھنے سے اغماض کریں۔ جس کی مشیت ابتدائی سدیم سے اخروی دھند تک یا ایک سدیم سے دوسرے سدیم تک کے مقابلے میں محض ایک عارضی وقفے کی سی ہے۔ نظام شمسی کے متعلق سائنسی نکتہ نظر الٰہیین کے شرف آدم کے راسخ عقیدے کو تقویت پہنچانے سے قاصر ہے۔

شرف آدم کے نظریئے کے علاوہ اور بھی گمراہی کے کئی مآخذ ہیں۔ ان میں سے ایک عجائبات سے شغف ہے۔ کچھ عرصے پہلے میں ایک سائنسی ذہن رکھنے والے مداری سے واقف تھا جو ایک مختصر مجمع کے سامنے اپنے شعبدے دکھایا کرتا تھا۔ پھر مجمع میں شامل ہر شخص سے الگ الگ جو کچھ اس نے دیکھا تھا' اس کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنے کے لئے کہتا۔ اکثر اوقات یونہی ہوتا کہ وہ حقیقت سے کہیں بڑھ چڑھ کر حیرت انگیز تاثرات کا اظہار کرتے۔ اور اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک کو یہ اصرار بھی ہوتا کہ اس نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اس قسم کی دروغ بافی افواہوں کے معاملے میں اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً الف ب سے کہتا ہے گزشتہ رات اس نے فلاں شخص کو دیکھا تھا جو شدومد سے امتناع شراب نوشی کا مبلغ ہے' کہ وہ نشے میں کچھ کچھ بہک رہا تھا۔ ب۔ ج کو اطلاع دیتا ہے کہ الف نے اس شخص کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر ج۔ د کو یہ خبر پہنچاتا

ہے کہ اسے ایک گڑھے میں مدہوشی کی حالت میں گرا ہوا پایا گیا تھا۔ پھر جب د۔ کی باری آتی ہے تو وہ یہ شوشہ چھوڑتا ہے کہ یہ شخص تو ہر شام نشے میں مدہوش گزارنے کے لئے خاص مشہور ہے۔ البتہ یہاں ایک اور محرک بھی در آتا ہے' یعنی بغض و کینہ۔ اپنے ہمسائیوں میں کیڑے ڈالنا، تو ہمارا ہمیشہ کا شعار رہا ہے اور پھر اس پر طرہ یہ کہ ہم بدترین بات کو کم سے کم ثبوت کی بنا پر قبول کر لینے پر آمادہ رہتے ہیں۔ تاہم یہ محرک کارفرما بھی ہو تو ہر محیرالعقول چیز کو فوراً قبول کر لیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ ہمارا کوئی شدید تعصب اس کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔ اٹھارویں صدی سے پہلے کی تاریخ عجائبات اور محیر العقول باتوں سے بھری پڑی ہے۔ جنہیں جدید تاریخ داں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ بہت حد تک قابل وثوق نہیں ہوتے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ علماء کا جدید مذاق ان باتوں کو ترجیح دینے لگا ہے جنہیں سائنس ممکن قرار دیتی ہے۔ شیکسپیئر نے سیزر کے قتل سے پہلے والی رات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''ایک عام غلام نے جسے آپ ایک نظر دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں' اپنا بایاں ہاتھ اٹھا رکھا تھا۔ جو اس طرح جگمگا رہا تھا جیسے 20 مشعلیں روشن ہوں۔ لیکن آگ کی حرارت اس کے ہاتھ پر کوئی اثر نہیں کر رہی تھی اور وہ سلامت کا سلامت رہا۔ میں نے تو اس وقت سے اپنی تلوار سونت رکھی ہے۔ کپٹیال (قصر امارت) کے سامنے میرا ایک شیر سے سامنا ہوا' جس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور غراتا ہوا گزر گیا۔ لیکن مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ اور ایک ٹیلے پر کچھ نہیں تو ایک سو خوفناک عورتیں ایک دوسرے پر گری پڑتی تھیں۔ خوف نے ان کے حلئے بگاڑ دیئے تھے۔ اور وہ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے آگ میں دہکتے ہوئے آدمیوں کو دیکھا ہے۔ جو گلیوں میں ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔''

یہ عجائبات شیکسپیئر کی تخلیقات نہیں ہیں۔ اس نے تو انہیں ان تاریخ دانوں کے بیانات سے اخذ کیا ہے جن پر ہم جولیس سیزر کے متعلق اپنی معلومات کے لئے تکیہ کرتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کسی عظیم شخصیت کی موت پر یا کسی نئی جنگ کے آغاز پر بالعموم واقع ہوتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں 1914ء کی جنگ پر فرشتے برطانوی سپاہیوں کی مدد کے لئے نازل ہوئے تھے۔ اس قسم کے واقعات کے لئے کبھی عینی شہادت موجود نہیں ہوتی' اور جدید مورخین انہیں قبول نہیں کرتے۔ البتہ مذہبی اہمیت کے حامل واقعات اس سے مستثنیٰ قرار

پاتے ہیں۔

دراصل ہر قوی التاثیر جذبہ اساطیر سازی کے رجحان کا حامل ہوتا ہے۔ اگر جذبے کا تعلق فرد سے ہو اور وہ اس کی بنا پر کسی داستان پر یقین کر بیٹھے تو اسے عموماً پاگل قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جب جذبے کی نوعیت اجتماعی ہو جیسے کہ حالت جنگ میں ہوتا ہے' تو کوئی شخص بھی ان داستانوں کی حقیقت کو جانچنے والا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اجتماعی جوش و خروش کے ہر عہد میں بے بنیاد افواہوں پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ ستمبر 1914ء میں انگلستان میں تقریباً ہر شخص یہ یقین رکھتا تھا کہ مغربی محاذ پر جنگ کرنے کے لئے روسی سپاہی انگلستان میں سے ہو کر گئے تھے۔ ہر شخص کسی ایسے شخص سے ضرور واقف تھا جس نے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن انہیں جاتے ہوئے خود دیکھنے والا ایک شخص بھی نہیں تھا۔

یہ داستان طرازی عموماً ظلم و تعدی سے منسلک ہو جاتی ہے۔ قرون وسطیٰ سے یہودیوں پر انسانی قربانی کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس الزام تراشی کے لئے ذرہ بھر ثبوت بھی موجود نہیں۔ نہ ہی کوئی سنجیدہ شخص جس نے اس الزام کا جائزہ لیا ہو' اس پر یقین رکھتا ہے۔ تاہم یہ تاثر آج بھی موجود ہے۔ مجھے ایسے سفید فام روسیوں سے ملنے کا موقع ملا ہے جو اس پر یقین رکھتے تھے۔ اکثر نازی بھی اسے بلا چون و چرا قبول کرتے تھے۔ اسی قسم کی داستانیں ستم رانی کے لئے جواز مہیا کرتی ہیں۔ دراصل یہ بے بنیاد تیقن اس لاشعوری خواہش کا ثبوت ہے کہ ہم ہمیشہ ظلم کے لئے کوئی تختہ مشق ڈھونتے رہتے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے اواخر تک یہ نظریہ رائج رہا ہے کہ پاگل پن شیطان کے تصرف کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ پاگل آدمی کو جو بدنی تکلیف پہنچتی ہے' تو اس کی ایذاء بد روح رشیطان پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مریض کو اتنی ایذا پہنچائی جائے کہ وہ بدروح مریض کو چھوڑ کر بھاگ جائے۔ اس نظریے کے مطابق پاگلوں کو بری طرح مارا پیٹا جاتا تھا۔ بادشاہ جارج سوم جب پاگل ہوا تو اس پر بھی یہی حربہ آزمایا گیا۔ لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ یہ ایک عجیب و غریب اور اذیت ناک حقیقت ہے کہ یہ قطعی طور پر بیکار علاج معالجہ کا طریقہ جو طب کی طویل تاریخ میں آزمایا جاتا رہا ہے' مریضوں کے لئے بے پناہ تکلیف کا باعث بنتا تھا۔ جب تخدیری ادویات ایجاد ہوئیں تو بزرگ یہ خیال کرتے تھے کہ یہ تقدیر الٰہی سے فرار کا ایک بہانہ ہیں۔ اگرچہ یہ دلیل

بھی پیش کی گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی ایک پسلی نکالی تھی تو اس سے پہلے ان پر گہری نیند طاری کر دی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کے لئے تو تخذیری عمل جائز ہے لیکن عورتوں کے لئے اذیت برداشت کرنا حوّا کی ازلی سزا کے حوالے سے گویا مقدر ہو چکا ہے۔ مغرب میں خواتین کے لئے حق رائے دہی سے اس نظریئے کی تکذیب ہو جاتی ہے۔ جاپان میں اب بھی زچگی کے دوران زچہ کی تکلیف میں تخذیری عمل سے تخفیف کی اجازت نہیں۔ جاپانی کتاب پیدائش پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس لئے اس نوع کی تکلیف رسانی کا سبب کچھ اور ہو گا۔

نسل و خون کے متعلق جو غلط روایات جڑ پکڑ چکی ہیں، اور جنہیں نازیوں نے اپنے سرکاری مسلک کا جزو بنا لیا تھا' ان کے لئے کوئی معروضی جواز موجود نہیں ہے۔ ان پر اعتقاد صرف اس وجہ سے ہے کہ ان سے انا کی اور اذیت رسانی کے جذبے کی تسکین ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں یہ اعتقادات ابتدائے تہذیب ہی سے موجود رہے ہیں۔ ان کا طریقہ کار جلد بدل جاتا ہے۔ لیکن روح وہی رہتی ہے۔ ہیرو ڈوٹس نے بتایا ہے کہ سائرس کی پرورش کسانوں کے ہاں ہوئی تھی اور اسے اپنے شاہی خون کا علم تک نہ تھا۔ 12 سال کی عمر میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ رہا اس کے شاہانہ رویے نے پول کھول دیا۔ یہ دراصل یورپی تہذیب میں رائج ایک پرانی کہانی کا چربہ ہے۔ یہاں تک کہ جدید دور میں بھی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خون خود بول پڑتا ہے۔ سائنس کے ماہرین عضویات لاکھ سمجھاتے رہیں کہ حبشی کے خون اور سفید فام شخص کے خون میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ جب امریکہ نے آخری جنگ میں شرکت کی تھی تو اسی عوامی مفروضے کے ماتحت امریکی ریڈ کراس سوسائٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ انتقال خون کے لئے حبشیوں کا خون استعمال نہ کیا جائے۔ بعد میں جب اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو یہ مان لیا گیا کہ صرف حبشی مریضوں کے لئے یہ خون استعمال ہو سکتا ہے۔ اسی طرح آریائی نسل کے جرمن سپاہیوں کے لئے جب خون کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ احتیاط برتی گئی کہ انہیں جو خون دیا جائے وہ یہودی خون کی آمیزش سے پاک ہو۔

جہاں تک نسل کا تعلق ہے مختلف معاشروں میں مختلف عقائد پائے جاتے ہیں۔ جہاں شہنشاہیت نے پکے قدم جما رکھے ہوں۔ وہاں بادشاہ کی نسل اس کی رعایا سے برتر ہوتی

ہے۔ تھوڑا عرصہ پہلے تک بالعموم یہ سمجھا جاتا تھا کہ مرد خلقی طور پر عورتوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر سپینوزا جیسا روشن خیال شخص بھی خواتین کو ووٹ کا حق دینے کا مخالف تھا۔ سفید فام لوگوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ سفید فام شخص قدرتی طور پر دوسرے رنگ والے لوگوں سے برتر ہیں۔ بالخصوص سیاہ رنگ والوں سے۔ جاپان میں اس کے برعکس پیلی رنگت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ہیتی میں جب حضرت عیسیٰؑ اور شیطان کے مجسمے بنائے جاتے ہیں تو وہ حضرت عیسیٰؑ کا مجسمہ سیاہ اور شیطان کا سفید بناتے ہیں۔ ارسطو اور افلاطون یونانیوں کی برتری کے اس حد تک قائل تھے کہ وہ غلامی کو روا رکھتے تھے۔ بشرطیکہ آقا یونانی ہو اور غلام بربری۔ امریکن قانون ساز جنہوں نے تارکین وطن کے لئے قوانین وضع کئے تھے وہ نارڈک قوموں کو سلاد اور لاطینی قوموں پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن جنگ کے دباؤ سے نازی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ جرمنی سے باہر کسی ملک میں صحیح النسل نارڈک نہیں پائے جاتے۔ ناروے کی قوم سوائے کیوزلنگ کے فن اور لیپ قوموں کے اختلاط کے باعث ناپاک ہو چکی تھی۔ چنانچہ یہ نسلی امتیاز سیاست میں بھی در آیا۔ نارڈک ہٹلر سے محبت کرتے تھے۔ اور جو یوں نہیں سوچتے تھے تو یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کا خون خالص نہیں رہا۔

تاہم ہر اس شخص کے لئے جو صاحب علم ہے، یہ محض خرافات ہے۔ امریکی سکولوں میں سب بچوں کو ایک نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ اور وہ ماہرین جو ذہانت کی درجہ بندی وغیرہ کرتے ہیں، یا طلبہ کی فطری اہلیت کا اندازہ لگاتے ہیں وہ کسی ایسے نسلی امتیاز کی نشاندہی نہیں کر سکے جس پر نسلی برتری کا مفروضہ قائم ہے۔ ہر نسلی یا قومی گروہ میں ذہین طلبہ بھی ہوتے ہیں اور غبی بھی۔ یہ ممکن نہیں کہ امریکہ میں سماجی کمتری کی وجہ سے سیاہ فام بچے اسی طرح ترقی کر سکیں جیسے سفید فام بچے کرتے ہیں۔ لیکن اگر خلقی ذہانت کو ماحول کے اثرات سے آزاد کیا جا سکے تو پھر مختلف گروہوں میں کوئی تمیز ممکن نہیں۔ نسلی برتری محض ایک افسانہ ہے۔ جسے قوت و طاقت کے اجارہ داروں کی انانیت نے ہوا دی ہے۔ ممکن ہے کسی دن بہتر ثبوت مہیا ہو جائے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ تعلیم دینے والے یہ ثابت کر سکیں کہ یہودی مجموعی حیثیت سے غیر یہودیوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ تاہم تا حال ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

یورپ کی آبادیوں پر نسلی امتیاز کے نظریئے کو مسلط کرنا ایک خاص طرح کی بے ہودگی کا

حامل ہے۔ یورپ میں کسی خالص نسل کا وجود نہیں ہے۔ روسیوں میں تاتاری خون کی آمیزش ہے۔ جرمن اکثر و بیشتر سلاو نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔فرانسیسی قوم میں کیلٹ جرمن اور بحیرہ روم کے خطے کی قوموں کی آمیزش موجود ہے۔ اٹلی کا بھی یہی حال ہے بلکہ روما سے جو سلاد یہاں آئے تھے ان کا اثر بھی موجود ہے۔ انگریزوں میں مقابلتاً سب سے زیادہ آمیزش پائی جاتی ہے۔اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ ایک خاص نسل سے تعلق کسی برتری کا باعث بنتا ہے۔ خالص نسلیں تو صرف پگمی' ہاٹن ٹاٹ یا آسٹریلیا کے اصلی باشندے ہیں۔تسمانیہ کی خالص نسل بھی ناپید ہو چکی ہے۔ تاہم ان کے ہاں کسی برتر ثقافت کے نشانات نہیں ملتے۔ قدیم یونانی اس کے برعکس شمالی وحشی قوموں اور مقامی باشندوں کی مخلوط نسل سے تھے۔ ایتھنز اور آیونیا کے رہنے والے جو بہت مہذب تھے' وہ تو اور بھی زیادہ مخلوط النسل تھے۔نسلی پاکیزگی کی مفروضہ خوبیاں یوں لگتا ہے، سرتا سر خیالی ہیں۔

خون کے متعلق پائے جانے والے توہمات کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ انسانی قتل کی مخالفت بھی ابتداء میں شاید اسی بنا پر کی گئی تھی جس کا تعلق اس رسمی ناپاکی سے ہے جو مقتول کے خون سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے قابیل سے اس طرح خطاب کیا۔ ''تیرے بھائی کے خون کی پکار میرے سامنے زمین سے اٹھ کر گریہ کرتی ہے۔'' بعض ماہرین بشریات کے نزدیک قابیل کی نقاب پوشی بھی اسی وجہ سے تھی کہ اس کے بھائی کا خون اسے ڈھونڈ نہ سکے۔ ماتمی لباس کی ابتدائی وجہ بھی یہی نظر آتی ہے۔ بہت سے پرانے معاشروں میں قتل عمد اور اتفاقی قتل میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ دونوں حالتوں میں پاکیزگی کی رسومات ادا کرنا ضروری تھا۔خون کی ناپاکی کا تصور اب بھی موجود ہے۔عورتوں کا پاکیزگی کے لئے گرجے جانا اور ماہواری خون کے متعلق پابندیاں بھی اسی کا شاخسانہ ہیں۔ یہ بات کہ بچے کی رگوں میں باپ کا خون دوڑتا ہے۔ اس کا باعث بھی یہی توہمات ہیں۔اصل میں تو باپ کا نہیں بلکہ ماں کا خون بچے کے جسم میں داخل ہوتا ہے۔اگر خون اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ سمجھا جاتا ہے تو پھر نسلی توارث کا سراغ مادرانہ تعلق سے لگانا چاہئے۔

روس میں جہاں کارل مارکس کے زیر اثر انقلاب کے بعد لوگوں میں جو تمیز اقتصادیات کی بنا پر قائم کی گئی ہے اس سے پیدا ہونے والی مشکل اس سے مختلف نہیں جو جرمنی میں نسلی امتیاز کے نظریہ سازوں نے سکنڈے نیویا کے رڈک باشندوں کے درمیان قائم کی تھی۔

مارکس کے نظریوں کے مطابق دو مختلف نظریوں کو باہم منطبق کرنے کی ضرورت تھی۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا تھا کہ پرولتاریہ اچھے ہیں اور باقی تمام لوگ برے۔ دوسری تعریف یوں تھی کہ کمیونسٹ اچھے ہیں باقی سب بُرے۔ دونوں نظریوں کو باہم منطبق کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ان میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معنی بدل دیئے جائیں۔ چنانچہ ''پرولتاریہ'' وہ لوگ قرار پائے جو حکومت کے حامی تھے۔ لینن اگرچہ پیدائشی طور پر شرفاء کی نسل سے تھا' اسے پرولتاریہ میں شمار کیا گیا۔ اس کے برعکس لفظ ''کولگ'' جس کا اصلی مفہوم امیر کسان تھا' اس سے مراد اجتماعی زراعت کا مخالف لی جانے لگی۔ اس قسم کی حماقتیں ان حالات میں ضرور سرزد ہوتی ہیں جب ایک گروہ کو خلقی طور پر دوسرے گروہ پر ترجیح دی جائے ۔ امریکہ میں ایک معزز سیاہ فام شخص کو اس کے مرنے کے بعد جو بلند تر اعزاز دیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ ''وہ ایک سفید فام شخص تھا'' ایک بہادر عورت کو ''مرد'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ میکبتھ اپنی بیوی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

''صرف لڑکے پیدا کرو تاکہ تمہارا بے خوف جوہر صرف مرد کی صورت میں ظہور کرے۔''

گفتگو کے یہ لہجے عمومی حماقتوں کو ترک نہ کرنے کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔

مادی (اقتصادی) دنیا میں بھی بہت سے توہمات عام ہیں، آخر لوگ سونے یا قیمتی پتھروں کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ صرف ان کی کمیابی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ ان میں بعض نادر خاصیات پائی جاتی ہیں جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان خصوصیات کی وجہ سے ماسوائے چند ماہرین کے کوئی ان کے لئے ایک دمڑی بھی خرچ کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک نظریئے کے مطابق جس کے متعلق بہت کچھ کہا سنا جا سکتا ہے' ابتداء میں سونے اور جواہرات کو اس لئے اہمیت دی جاتی تھی کہ انہیں کچھ جادوئی خصوصیات کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں حکومتوں کی حماقتیں بھی یہ ثابت کرتی ہیں کہ اس مفروضہ کا اثر ابھی باقی ہے۔ مثلاً 1914-18ء کی جنگ کے بعد یہ طے پایا تھا کہ جرمنی ایک بہت بڑی رقم برطانیہ اور فرانس کو دے گا۔ اور اسی طرح وہ اتنی ہی بڑی رقم امریکہ کو ادا کرے گا۔ ان میں سے ہر حکومت چاہتی تھی کہ انہیں مطلوبہ رقم اشیاء کی بجائے روپے پیسے کی شکل میں دی جائے۔ صاحبان حل وعقد یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ

دنیا میں اتنی نقدی موجود ہی نہیں۔ وہ یہ بھی نہ جان سکے کہ نقدی سے اگر اشیاء کی خریداری مطلوب نہ ہو تو وہ بے مصرف ہوتی ہے۔ اگر نقدی کو اس طرح استعمال میں نہ لایا جائے تو وہ کسی کام کی نہیں رہتی۔ سونا کسی ایسے مخفی اسرار کا حامل تھا جس کی بنا پر اسے ٹرانسوال میں کانوں سے نکالا گیا اور دوبارہ امریکہ میں بینکوں کے تہہ خانوں میں مقفل کر دیا گیا۔ بالآخر یوں ہوا کہ مقروض ممالک کے ہاں نقدی ختم ہو گئی اور چونکہ انہیں اشیاء کی شکل میں ادائیگی کی اجازت نہیں تھی' وہ دیوالیہ ہو گئے۔ نتیجتاً جو خوفناک کساد بازاری وجود میں آئی' وہ براہ راست اسی توہم کا نتیجہ تھی کہ سونے میں کچھ اسرار پائے جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ توہم ختم ہو رہا ہے' لیکن اس کی جگہ کوئی اور واہمہ لے لے گا۔

سیاست میں بھی لغو چٹکلوں کا بہت چلن ہے۔

ایک مقولہ جسے بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہے یوں ہے: ''انسان کی فطرت کو بدلا نہیں جا سکتا'' ظاہر ہے کوئی شخص بھی یہ بات طے کئے بغیر کہ ''انسانی فطرت'' سے کیا مراد ہے۔ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ مقولہ غلط ہے یا صحیح۔ لیکن جس طرح اسے بالعموم استعمال کیا جاتا ہے' یہ صریحاً غلط ہے۔ مثلاً جب ایک صاحب ''الف'' نامی اس مقولے کو ادعائی قطعیت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمام انسان' دنیا کے ہر خطے میں اور ہر عہد میں بعینہ اسی طرح عمل کرتے رہیں گے۔ جس کا ان کے اپنے شہر میں رواج ہے۔ بشریات کا تھوڑا سا علم بھی اس زعم کو' باطل ثابت کرنے کے لئے کفایت کرے گا۔ تبت میں ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے ہیں۔ کیونکہ لوگ بالعموم اتنے غریب ہیں کہ وہ الگ الگ ایک بیوی کے بار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ تاہم وہاں خاندانی زندگی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ناخوشگوار نہیں ہے۔ غیر مہذب قبائل میں اپنی بیوی کو مہمان کی خدمت میں پیش کرنے کا رواج عام ہے۔ آسٹریلیا کے اصلی باشندے عنفوان شباب میں ایک اذیت ناک آپریشن کرواتے ہیں جس سے ان کی قوت رجولیت عمر بھر کے لئے کم ہو جاتی ہے۔ نومولود بچوں کا قتل' جو بظاہر انسانی فطرت کے خلاف نظر آتا ہے' عیسائیت کے فروغ سے پہلے بہت عام تھا۔ حتیٰ کہ افلاطون نے بھی کثرت آبادی سے بچنے کے لئے اس کی تائید کی تھی۔ نجی ملکیت بعض وحشی قبائل میں روا نہیں رکھی جاتی۔ بہت ترقی یافتہ معاشروں میں بھی اقتصادی ضرورتیں' انسانی فطرت پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ ماسکو میں جہاں مکانوں کی بے حد قلت

ہے، جب کوئی غیر شادی شدہ عورت حاملہ ہو جاتی ہے تو کئی مرد اس کے ہاں ہونے والے بچے کی ولدیت کے دعویدار بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے جو بھی بچے کا والد نامزد ہو جائے وہ اس عورت کے ساتھ اس کے کمرے کا ساجھی بن جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آدھا کمرہ بہرحال کھلے آسمان سے تو بہتر ہوتا ہے۔

فی الاصل بالغ افراد میں انسانی فطرت، تعلیمی حالات کے مطابق مختلف نوعیّتوں کی حامل ہوتی ہے۔ خوراک اور جنس عام ضروریات میں شامل ہیں۔ لیکن تھیبائڈ کے راہب جنس سے مکمل پرہیز اور خوراک سے بھی قلیل ترین حد تک متمتع ہوتے ہیں۔ جو زندہ رہنے کے لئے کافی ہو۔ خوراک اور تربیت سے لوگوں کو حسب خواہش نرم خو، خود سر یا غلامانہ ذہنیت کا حامل بنایا جا سکتا ہے۔ کوئی حماقت بھی اتنی بری نہیں ہوتی کہ اسے ایک مناسب حکومتی اقدام سے ایک بڑی اکثریت کا عقیدہ نہ بنایا جا سکے۔ افلاطون نے اپنی جمہوریت کا خاکہ ایک ایسے قصہ پر استوار کیا تھا، جسے وہ خود لغو سمجھتا تھا۔ لیکن اس کا یہ اعتماد کہ لوگوں کو اسے قبول کر لینے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، یقیناً صحیح تھا۔ ہابز جو یہ سمجھتا تھا کہ لوگوں کو حکومت کا احترام کرنا چاہئے۔ خواہ وہ کیسی ہی ناقص کیوں نہ ہو۔ اس دلیل کے جواب میں کہ عوام کو کسی نامعقول چیز قبول کرنے پر آمادہ کرنا مشکل ہے یہ کہتا ہے کہ آخر انہوں نے عیسائیت کو بھی تو قبول کر لیا تھا۔ بالخصوص نظریہ قلب ماہیت کو۔ (یعنی روٹی اور شراب کا حضرت عیسیٰؑ کے گوشت اور خون میں بدل جانا) اگر وہ 1940ء میں زندہ ہوتا تو اسے جرمنی نوجوانوں کی نازیت پسندی میں اپنے مزعومہ (ادعا) کا وافر ثبوت میسر آ جاتا۔

بڑی مملکتوں کے قیام کے بعد سے عوام کے اعتقادات پر حکومتوں کا تسلط بہت بڑھ گیا ہے۔ اہل روما نے ایک بڑی تعداد میں عیسائیت کو اس لئے قبول کر لیا تھا کہ رومن شہنشاہ عیسائی ہو گیا تھا۔ سلطنت روما کے ان حصوں میں جن پر مسلمان قابض ہو گئے تھے، بہت سے لوگوں نے عیسائیت کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ سولہویں صدی میں یورپ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ خطوں کا قیام حکومتوں کے رجحانات کا تابع تھا۔ عوامی اعتقادات پر فی زمانہ حکومت کا تسلط پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ عقیدہ غلط بھی ہو تو اگر وہ بہت سے لوگوں کے اعمال پر حاوی ہو تو اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس ضمن میں گزشتہ عالمی جنگ سے پہلے جاپان، روس اور جرمنی میں حکومتوں نے جن عقائد کو پروان چڑھایا، وہ بہت

اہم تھے۔ چونکہ یہ باہم ایک دوسرے سے متصادم تھے اس لئے سب کے سب صحیح قرار نہیں پاتے۔ تاہم وہ سب کے سب غلط ہو سکتے تھے۔ بدقسمتی سے ان میں لوگوں کے لئے ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کی زبردست ترغیب موجود تھی۔ یہ جذبہ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ حفظ ذات کی خواہش اس سے مغلوب ہو چکی تھی۔ بین ثبوت کی موجودگی میں اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اگر فوجی قوت حاصل ہو تو پھر متعصب جنونی آبادی پیدا کر لینا آسان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک سنجیدہ اور معقول قوم کی تشکیل بھی حکومت کے لئے آسان ہے لیکن عموماً حکومتیں ایسا کرتی نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس صورت حال میں لوگ حکومت کے کرتا دھرتا سیاست دانوں کی توقیر کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

اس نظریئے کی کہ انسان فطرت کو بدلا نہیں جا سکتا' ایک مکروہ صورت یہ ہے کہ اس بے سروپا ادعا پر اصرار کیا جاتا ہے کہ جنگیں تو ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔ کیونکہ ہماری ساخت ہی ایسی ہے کہ ہمیں ان کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ لوگوں کو جس قسم کی خوراک ملتی ہے' اور جن خطوط پر ان کو تعلیم دی جاتی ہے' اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ جب انہیں اشتعال دلایا جائے تو وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ تاہم وہ اس وقت تک عملاً جنگ نہیں چھیڑیں گے جب تک انہیں فتح کا یقین نہ ہو۔ اگر آپ کو کوئی سپاہی روک لے تو آپ کو غصہ تو آتا ہے' لیکن آپ اس سے لڑتے نہیں اس لئے کہ جانتے ہیں کہ حکومت کی زبردست طاقت اس کی پشت پناہی کے لئے موجود ہے۔ وہ لوگ جنہیں جنگ کا موقعہ نہیں ملتا' نفسیاتی طور پر کسی محرومی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ سویڈن نے 1814ء کے بعد سے کوئی جنگ نہیں لڑی۔ لیکن سویڈن قوم دنیا کی سب سے زیادہ خوش اور مطمئن قوم ہے۔ ان کی قومی سرخوشی پر صرف اس خوف کا بادل منڈلا رہا ہے کہ کہیں انہیں آئندہ جنگ میں جھونک نہ دیا جائے۔ اگر سیاسی ادارے ایسے ہوں جو واضح طور پر جنگ کو بے مصرف ظاہر کر سکیں تو انسانی سرشت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کے وقوع پر مجبور کر سکے۔ یا عام لوگوں کو اس وجہ سے ناخوش بنا دے کہ جنگ کیوں نہیں ہو رہی۔ وہی دلائل جن سے اب یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جنگ کی روک تھا ناممکن ہے' وہی پہلے زمانے میں ڈوئل لڑنے کے حق میں استعمال کئے جاتے تھے۔ لیکن آج ہم میں سے شاید ہی کوئی اس وجہ سے احساس محرومی کا شکار ہو کہ اسے ڈوئل لڑنے کا موقعہ نہیں دیا جا رہا۔

مجھے یہ ماننے میں قطعاً کوئی تامل نہیں ہے کہ ان لغویات کی کوئی حد ہی نہیں جو حکومتی اقدام سے پھیلائی جا سکتی ہیں اور جنہیں قبول عام حاصل ہو جاتا ہے۔ مجھے ایک معقول فوج مہیا کر دیجئے' ساتھ ہی مجھے یہ تصرفات بھی حاصل ہوں کہ میں انہیں عام لوگوں کے مقابلے میں بہتر خوراک اور بہتر تنخواہ دے سکوں تو میں اس مہم کا بیڑا اٹھانے کے لئے تیار ہوں کہ تیس برس کے اندر ملک کی آبادی کی اکثریت کو یہ ماننے پر آمادہ کر لوں گا کہ دو جمع دو تین ہوتے ہیں چار نہیں یا یہ کہ پانی جب گرم ہو جاتا ہے تو جمنے لگتا ہے۔ اور جب اسے سردی پہنچائی جائے تو وہ ابلنے لگتا ہے۔ یا اسی قسم کی کوئی اور بے معنی بات جو حکومت کے مقاصد کے لئے کارآمد ہو۔ تاہم یاد رہے کہ ان عقائد کے عام ہو جانے کے باوجود لوگ کیتلی کو پانی ابالنے کے لئے ریفریجریٹر میں نہیں رکھیں گے۔ یہ اعتقاد کہ سردی سے پانی ابلنے لگتا ہے' یک شنبہ کی تقدیس کی طرح ایک عقیدہ ہو گا۔ مقدس اور پراسرار۔ جس کا خوفزدہ لہجے میں اعتراف تو کیا جائے گا لیکن روز مرہ کی عملی زندگی پر اس کے کچھ بھی نتائج مرتب نہ ہوں گے۔ صرف یوں ہو گا کہ اس کا زبانی انکار غیر قانونی قرار دیا جائے گا۔ اور اس قسم کے کفر کے مرتکب ہونے والے کو لٹکا کر ''یخ بستہ'' کر دیا جائے گا۔ جو شخص بھی حکومتی نظریئے کو خلوص سے قبول نہیں کرے گا اسے تعلیم و تبلیغ کی اجازت نہیں ہو گی اور نہ وہ کسی مقتدر عہدے پر فائز ہو سکے گا۔ بلند ترین عمائدین دعوتوں میں آپس میں بھی کھسر پھسر کرتے رہیں گے کہ یہ کیا واہیات ہے۔ پھر ہنسیں گے اور دوبارہ جام کو منہ سے لگا لیں گے۔ جدید حکومتوں کے زیر اثر جو کچھ ہو رہا ہے میں اس کا خاکہ اڑانے کی کوشش نہیں کر رہا یہ حقیقت بیانی ہے۔

یہ دریافت کو حکومتیں سائنسی طریق کار سے لوگوں کو جس سانچے میں چاہیں ڈھال سکتی ہیں' اور یہ کہ حکومتیں بڑے بڑے گروہوں کا رخ ادھر سے ادھر موڑ سکتی ہیں ہماری بدنصیبیوں کا ایک باعث ہے۔ ذہنی طور پر آزاد خیال آبادی خام مواد کے ڈھیر کی طرح ہے اور دوسری طرف جدید پروپیگنڈے کے ذریعے ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہوا معاشرہ ایک جنگی جہاز کی مانند ہے۔ تعلیم کو ابتداء میں اس لئے عام کیا گیا تھا کہ اس طرح سب لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں گے۔ لیکن اب اسے دوسرے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں لغویات کو اس طرح راسخ کر دیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں اتفاق رائے پیدا ہو

جاتا ہے۔ جو اجتماعی جوش و خروش کو جنم دیتا ہے۔ اگر تمام حکومتیں ایک ہی قسم کی لغویات کو فروغ دیں تو نقصانات اتنے عظیم نہیں ہوں گے۔ بدقسمتی سے ہر ایک حکومت کا اپنا الگ الگ نظریہ ہے۔ یہ اختلاف رائے باہمی مناقشت کو جنم دیتا ہے۔ اگر دنیا میں امن قائم کرنا ہے تو پھر حکومتوں کو یا تو اپنے اپنے مزعومات کو ترک کرنا ہوگا یا ایک ہی قسم کے مزعومات کو اپنانا ہوگا۔ ان میں سے اوّل الذکر میرے خیال میں خیالی پلاؤ پکانے والی بات ہے۔ لیکن شاید حکومتیں مجموعی طور پر یہ تعلیم دینے پر رضامند ہو جائیں کہ تمام سرکاری کارندے وہ جہاں بھی ہوں، نیک نہاد ہوں اور مکمل طور پر عاقل۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ جنگ کے بعد جو سیاست دان زندہ بچ نکلیں وہ اس طرح کے کسی پروگرام پر متفق ہونے میں عافیت محسوس کریں۔

اب مشکل یہ ہے کہ اگر مطابقت میں کچھ خطرات ہیں تو عدم مطابقت میں بھی ان کی گنجائش ہے۔

بعض ''سرکردہ مفکر'' سمجھتے ہیں کہ جو شخص بھی رسمی رائے سے اختلاف کرتا ہے وہ یقیناً راستی پر ہوتا ہے۔ یہ بھی صرف ایک واہمہ ہے ایک غلط بینی ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو حق و صداقت کو پا لینا نسبتاً سہل ہو جاتا۔ گمراہی کو رائج الوقت سچ کے مقابلے میں آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ میں ایک دفعہ ایک بجلی کے انجینئر سے ملا۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا ''کہئے کیا حال ہے ایمان کی تلقین کے دو ہی طریقے ہیں ایک وہ جو حضرت عیسیٰؑ نے اپنایا دوسرا وہ جسے بہت سے عیسائی سائنس دان اختیار کرتے ہیں۔ میں نے پہلے طریقے کو ترجیح دی ہے۔'' تھوڑے ہی عرصے بعد اسے جیل جانا پڑا کیونکہ اس نے حساب کتاب میں گھپلا کیا تھا۔ قانون اس خطے میں ایمان کی عمل داری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ میں پاگل پن کے ایک اعلیٰ پائے کے معالج کو جانتا ہوں جس نے فلسفے کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور ایک نئی منطق کی تعلیم دینے لگا۔ جس کے متعلق اس نے واضح طور پر اقرار کیا کہ اس نے اسے اپنے پاگل مریضوں سے حاصل کیا تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو اس نے اپنی وصیت میں اپنی جائیداد کو اپنے علم کی ترویج کے لئے ایک پروفیسر کا عہدہ قائم کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس نے کوئی جائیداد چھوڑی ہی نہیں تھی۔ حساب کتاب اس نئی منطق کے ساتھ نہ چل سکا۔ ایک دفعہ ایک شخص میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا کہ وہ فلسفے میں دلچسپی

رکھتا ہے لہٰذا میں اپنی چند کتابیں اس کے مطالعہ کے لئے منتخب کر دوں۔ میں نے اسے ایک فہرست تھما دی لیکن اگلے ہی دن وہ پھر آ گیا اور کہنے لگا کہ ان میں سے ایک کتاب وہ پڑھتا رہا ہے۔ اور اس میں صرف ایک بیان ایسا تھا جو اس کے پلے پڑا۔ اور وہ بیان اسے غلط لگتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بیان کون سا تھا۔ اس نے کہا وہ بیان یہ ہے ''جولیس سیزر مر گیا ہے۔'' میں نے وجہ پوچھی وہ اپنے آپ کو سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جواب دیا ''اس لئے کہ جولیس سیزر میں ہی تو ہوں۔'' ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ سنکی ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ آپ راستی پر ہیں۔

سائنس اب تک ہمیشہ غلط عقائد کے خلاف جدوجہد کرتی رہی ہے اور آج اسے نفسیات کے خلاف ایک سخت معرکہ درپیش ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ انسانی فطرت کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ ہمیشہ بُری طرح مغالطے کا شکار ہوتے ہیں۔ بعض لڑکے اس صفت سے محروم رہتے ہیں جسے تمیز کہا جاتا ہے۔ ان کے بزرگ جو بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتے ان کی پٹائی کرتے ہیں۔ اور جب وہ پھر اسی بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو دوبارہ پٹتے ہیں۔ جن ماہرین نے مسئلے کا جائزہ لیا ہے وہ جانتے ہیں کہ سزا الٹا عیب کو پختہ تر کر دیتی ہے۔ بعض اوقات عیب کا باعث جسمانی بھی ہوتا ہے لیکن بیشتر نفسیاتی۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اس رنج و ملال کو دور کیا جائے جس کی جڑیں باطن میں گہری اتر چکی ہوتی ہیں۔ ان کی نوعیت غالباً لاشعوری ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ تنگ کرنے والوں کو سزا دینے میں ایک لذت محسوس کرتے ہیں۔ اور اس لئے طبی رائے کو رد کر دیا جاتا ہے۔ یہی معاملہ ان لوگوں کا بھی ہے جو ستر نما ہوتے ہیں۔ انہیں بار بار جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ پھر بھی جونہی وہ رہا ہوتے ہیں' اسی حرکت کا اعادہ کرنے لگتے ہیں۔ ایک طبیب نے جو ان امور میں خصوصی مہارت رکھتا تھا، مجھے یقین دلایا کہ ستر نمائی کا سادہ سا علاج یہ ہے کہ اس شخص کے پاجامے کے بٹن سامنے کی بجائے پیچھے لگا دیئے جائیں۔ اس طریق کار کو محض اس لئے نہیں اپنایا جاتا کہ یہ لوگوں کے انتقامی جذبے کی تسکین نہیں کرتا۔

ایک عمومی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سزا صرف ان جرائم کی روک تھام کر سکتی ہے جو اختیاری ہوں۔ لیکن جن کی اساس کسی نفسیاتی سقم پر ہو' وہاں یہ حربہ ناکام رہتا ہے۔ اب

اس بات کو جزوی طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ ہم سادہ چوری اور خبط سرقہ میں فرق ملحوظ رکھنے لگ گئے ہیں۔ چوری کا سبب سوچی سمجھی خود غرضی ہوتی ہے جبکہ خبط سرقہ کسی عجیب وغریب سبب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جنون قتل کے مریض سے اب عام قاتل کی طرح سلوک نہیں کیا جاتا۔ تاہم جنسی جرائم اتنے اشتعال انگیز ہوتے ہیں کہ ان کے معاملے میں اب بھی سزا کی بجائے طبی طریق کار کو اپنانا ناممکن ہے۔ برائی کے خلاف ناپسندیدگی عام حالتوں میں ایک مفید سماجی قوت ہے۔ لیکن ان لوگوں کے خلاف اس کا استعمال جائز نہیں۔ جو ایسے امراض کا شکار ہوں۔ جن کا علاج صرف طبی مہارت ہی سے ممکن ہے۔

یہی معاملہ پوری قوم کے ساتھ بھی پیش آتا ہے۔18-1914ء کی جنگ میں قدرتی طور پر لوگوں کا انتقامی جذبہ جرمنوں کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ چنانچہ شکست کے بعد انہیں سخت ترین سزا دی گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ دلیل دی جاتی تھی کہ معاہدہ و رسلز کی شرائط بہت نرم تھیں۔ کیونکہ یہ جرمن قوم کو کوئی سبق نہ سکھا سکیں۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس دفعہ ہمیں واقعی سخت گیری سے کام لینا چاہئے۔ میرے خیال میں ہم جرمنی کے تشدد اور جارحیت بڑی آسانی سے یوں روک سکتے تھے اگر ہم نازیوں کے کرتا دھرتا کو عام مجرموں کی بجائے جنونی تصور کرتے۔ یہ درست ہے کہ جنوں کی روک تھام بھی ضروری ہے۔ لیکن پاگلوں کو عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں خوش رکھا جائے۔ سب جانتے ہیں اگر ایک جنونی قاتل کی زندگی کو تلخ تر بنا دیا جائے تو اس کا جنون قتل اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نازیوں میں کچھ لوگ واقعی مجرم تھے۔ تاہم ان میں سے کثیر تعداد ان کی تھی جو کم و بیش پاگل پن کے مریض تھے۔ اگر جرمنی کو کامیابی کے ساتھ مغربی یورپ کا حصہ بنانا ہے تو ہمیں اس رجحان کو مطلقاً ترک کرنا پڑے گا جو ان کو خصوصی مجرم ٹھہرانے پر مائل ہے۔ جنہیں سزا دی جاتی ہے۔ وہ اپنے سزا دینے والوں کے متعلق کبھی ہمدردانہ یا رحم کا جذبہ نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ جب تک اہل جرمنی باقی نوع انسانی سے نفرت کرتے رہیں گے۔ عالمی امن خطرے ہی میں رہے گا۔

جب ہم وحشی اقوام یا قدیم بابل اور مصر کے باشندوں کے اعتقادات کے متعلق پڑھتے ہیں۔ تو ان کی متلون لغویات ہمیں حیران کر دیتی ہیں۔ تاہم ایسے اعتقادات جو اتنے ہی لغو ہیں، آج بھی ناخواندہ لوگوں کے ہاں جدید ترین اور مہذب ترین سماجوں میں موجود ہیں۔

مجھے امریکہ میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ مارچ کے مہینے میں پیدا ہونے والے لوگ بدقسمت ہوتے ہیں۔ اور مئی کے مہینے میں پیدا ہونے والے خاص طور پر بکثرت گھٹے (یا گٹے) پڑنے کا شکار ہوتے ہیں۔ مجھے اس وہم کی تاریخ کا علم نہیں۔ غالباً اسے بابل یا مصر کے پروہتوں کی خرافات سے اخذ کیا گیا ہوگا۔ معتقدات شروع تو سماج کے اوپر کے طبقوں میں ہوتے ہیں۔ پھر دریا کی کیچڑ کی طرح آہستہ آہستہ نیچے کی طرف ناخواندہ طبقوں یں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس عمل میں انہیں زیریں ترین طبقتوں تک پہنچنے میں تین چار ہزار سال تک لگ سکتے ہیں۔ امریکہ میں آپ کی حبشی ماما کسی ایسے قول کا حوالہ دے گی جو افلاطون سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس کا صاحبان علم کبھی حوالہ نہیں دیتے۔ کیونکہ یہ ان اقوال میں سے اخذ کیا جاتا ہے جہاں افلاطون واضح طور پر خرافات بک رہا ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ قول ہے کہ جو لوگ اپنی موجودہ زندگی میں عقل و دانش کے ماحول کے لئے تگ و دو نہیں کرتے وہ آئندہ زندگی میں عورت کے روپ میں جنم لیں گے۔ شارحین عظیم فلسفیوں کے احمقانہ اقوال کو عموماً مودبانہ طور پر نظر انداز کر دیتے تھے۔

ارسطو اپنی عقل و دانش کے باوجود خرافات کی پوٹ ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ حمل ٹھہرنے کا وقت سردی کا موسم ہونا چاہئے جب شمالی ہوائیں چلتی ہیں' یا یہ کہ جو لوگ نوعمری میں شادی کرتے ہیں' ان کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ عورتوں کا خون قدرے سیاہی مائل ہوتا ہے۔ اور یہ کہ حیوانات میں صرف خنزیر خسرہ کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ یا یہ کہ اگر کوئی ہاتھی بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہو تو اس کے شانوں پر نمک' روغن زیتون اور گرم پانی کے آمیزہ کی مالش کرنی چاہئے۔ یا یہ کہ عورتوں کے دانت مردوں سے کم ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تاہم فلسفیوں کی اکثریت اسے مجسم دانائی شمار کرتی ہے۔

مبارک اور منحوس دنوں کے متعلق توہمات عالمگیر حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم زمانے میں جرنیلوں کے اقدامات ان توہمات کے تابع ہوتے تھے۔ ہمارے زمانے میں بھی' جمعہ کے خلاف تعصب یا 13 کے ہندسے کی نحوست بہت فعال ہیں۔ ملاح عموماً جمعہ کے دن سے سفر کا آغاز نہیں کرتے، کئی ہوٹلوں میں کسی منزل کا نمبر 13 نہیں ہوتا۔ ان تعصّبات پر پہلے تو وہ لوگ بھی یقین رکھتے تھے جنہیں عقلمند سمجھا جاتا تھا۔ اب دانشور انہیں بے ضرر حماقتیں قرار

دیتے ہیں۔لیکن شاید آج سے دو ہزار سال بعد ہمارے عہد کے دانشمندوں کے عقائد بھی اسی طرح احمقانہ نظر آئیں۔انسان میں خوش اعتقادی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔کسی نہ کسی چیز پر تو اسے یقین کرنا ہی ہوتا ہے۔اگر معقول وجوہات پر مبنی اعتقادات نہ ہوں تو پھر مجبوراً خام خیالی پر ہی بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

''فطرت'' اور ''فطری'' پر اعتقاد بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ تصور پہلے بھی اور آج بھی دنیائے طب میں راسخ ہے انسانی جسم کو اگر اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنا علاج خود کر لیتا ہے۔ چھوٹے موٹے زخم بھر جاتے ہیں۔نزلہ زکام از خود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات تو اچھی خاصی خطرناک بیماریاں بھی بغیر علاج کے رفع ہو جاتی ہیں۔ تاہم ان صورتوں میں بھی فطرت کو مدد بہم پہنچانا ضروری ہے۔ بے احتیاطی سے زخم بگڑ سکتے ہیں۔ سردی لگنے سے نمونیہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خطرناک بیماریوں کو بغیر علاج کے وہی لوگ جھیل سکتے ہیں جو کسی مہم پر ہوں یا کسی دور دراز علاقے میں سفر کر رہے ہوں۔ جہاں علاج معالجہ کی سہولت میسر نہ ہو۔ بہت سی ایسی عادات جنہیں اب فطری کہا جاتا ہے۔ آغاز میں غیر فطری تھیں۔ مثلاً نہانا، دھونا یا لباس۔ لوگوں نے لباس کے استعمال سے پہلے یقیناً یہ محسوس کیا ہو گا کہ سرد خطوں میں اس کے بغیر گزارہ ممکن نہیں۔ جہاں صفائی کا فقدان ہو وہاں لوگ عموماً بہت سے امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹائی فس (تپ محرقہ) جس سے اب مغرب کی اقوام مامون ہو چکی ہیں۔اسی طرح حفاظتی ٹیکوں کو پہلے بھی اور کچھ لوگ اب بھی غیر فطری قرار دیتے ہیں۔ تاہم اس قسم کی غلط اندیشی میں تسلسل یا استحکام نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص بھی یہ نہیں مانتا کہ کوئی ٹوٹی ہوئی ہڈی خود بخود فطری طریقے سے اپنی صحیح جگہ پر جڑ جائے گی۔ پکائی ہوئی خوراک غیر فطری چیز ہے۔ گھروں کو گرم رکھنا بھی غیر فطری ہے۔چینی فلسفی لاوتزو (تقریباً 600 ق م) نے کشتیوں، پلوں اور سڑکوں کو غیر فطری کہہ کر مسترد کر دیا تھا۔ چنانچہ ان مصنوعی تکلفات سے بیزار ہو کر اس نے ترک وطن کے بعد مغرب کی وحشی اقوام میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اسی طرح تہذیب و تمدن کے سلسلے میں ہر قوم کو ابتداء میں غیر فطری قرار دیا گیا تھا۔

برتھ کنٹرول کے خلاف سب سے عام دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ خلاف فطرت ہے۔ پتہ نہیں کن وجوہات کی بنا پر ہمیں یہ کہنے کی اجازت نہیں ہے کہ تجرد بھی خلاف فطرت ہے۔

میری سمجھ میں صرف ایک بات آتی ہے کہ یہ رسم بہت پرانی ہے۔

مالتھوس کے نزدیک آبادی کو محدود کرنے کے صرف تین طریقے ہیں۔ اخلاقی ضبط' خلاف فطرت برائی اور غربت۔ لیکن اخلاقی ضبط۔ اسے معلوم تھا کہ بڑے پیمانے پر کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ رہی خلاف فطرت برائی یعنی برتھ کنٹرول تو اپنے کلیسائی تعصب کی وجہ سے وہ اسے نفرت سے دیکھتا ہے۔ رہ گئی غربت۔ تو اپنی آسائشوں میں مگن اس کے نزدیک اکثریت کی غربت میں بھی ایک طمانیت کا پہلو ہے۔ اور وہ لوگ جو اسے ختم کرنے کے خواب دیکھتے ہیں' اس نے ان کے نکتہ نظر کی غلطی پر اصرار کیا ہے۔ موجودہ عہد میں برتھ کنٹرول کے مخالف بھی اخلاقی جرات کے مالک نہیں۔ وہ اس خیال کا سہارا لیتے ہیں کہ خدا سب کا رازق ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا نے اس رزاقی سے آج تک کام نہیں لیا۔ بلکہ وہ نوع بشر کو وقفے وقفے سے قحط سالی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ جس کے باعث لاکھوں انسان موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقعی اپنے عقیدے میں سچے ہیں تو پھر یہ سمجھنا چاہیے کہ انہوں نے یہ امید لگا رکھی ہے کہ اس لمحے کے بعد سے خدا کی طرف سے مسلسل روٹیوں اور مچھلی کا نزول ہوتا رہے گا۔ جس معجزے کے ظہور کی کسی وجہ سے آج تک اس نے ضرورت محسوس نہیں کی یا شاید وہ یہ کہیں کہ اس دنیا کے رنج و محن معمولی چیزیں ہیں۔ اہمیت تو آخرت کو حاصل ہے۔ ان کی اپنی الہیات کے مطابق بہت سے ایسے بچے جو ان کی برتھ کنٹرول کی مخالفت کے باعث وجود میں آئیں گے وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ چنانچہ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ وہ دنیوی زندگی کی آسائشوں کی اس لئے مخالفت کر رہے حیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ابدی عذاب برداشت کرنا چاہئے۔ ان کے مقابلے میں مالتھوس رحم دل نظر آتا ہے۔ (مختصراً یوں سمجھئے کہ مالتھوس یہ سمجھتا ہے کہ اس دنیا کے مصائب آخرت میں نجات کا باعث بنیں گے۔ اس کے برعکس دوسرے اہل کلیسا کے اعتقاد کے مطابق انسان ازلی گناہ کی پاداش میں جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ چنانچہ آبادی جتنی بڑھے گی اسی نسبت سے دوزخیوں کی تعداد بھی بڑھتی جائے گی۔)

عورت سے ہماری گہری محبت اور نفرت وابستہ ہے۔ اس کے نتیجے میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں اس کا اظہار بھی روایتی دانش میں بہت ہوا ہے۔

عورت کے موضوع پر مرد ہو یا عورت ہر شخص اپنی اپنی جگہ کچھ بے جواز مفروضے گھڑ لیتا ہے۔ شادی شدہ مرد کے مفروضے اس کی زوجہ کے حوالے سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔ جبکہ خواتین خود اپنی ذات کے حوالے سے ان کو تشکیل دیتی ہیں۔ عورت کے متعلق مردوں کی آراء کی تاریخ مرتب کرنا ایک دلچسپ مشغلہ ہوگا۔ ازمنہ قدیمہ میں جب مرد کی فوقیت ایک مسلمہ امر تھی اور عیسوی اخلاقیات کا چلن نہیں تھا انہیں بُری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ افلاطون ڈرامے پر اس اعتراض کو بہت اہمیت دیتا تھا کہ ڈرامہ نگار کے لئے نسوانی کرداروں کی تخلیق کے سلسلے میں عورت کی نقالی ناگزیر تھی۔ عیسائیت کے فروغ کے بعد عورت نے ایک نیا روپ دھار لیا۔ اب اس کو ترغیب وتحریص کا مظہر قرار دیا گیا۔ اس کے برعکس ساتھ ہی اس میں ولی بننے کی صلاحیت کا بھی اقرار کیا گیا۔ وکٹورین عہد میں اس کی ولی بننے کی صلاحیت کو ترغیب دہندہ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی گئی۔ اس عہد کے مرد گویا اپنے آپ کو ترغیب وتحریص سے بالاتر سمجھتے تھے۔ بہرحال عورت کی اسی برتر خوبی کے باعث اسے سیاست سے دور رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ کیونکہ اس میدان میں خوبی کے کسی اعلیٰ معیار کا تصور ناممکن تھا۔ لیکن ابتدائی عہد میں حقوق نسواں کے علمبرداروں نے اس دلیل کا رخ ہی بدل ڈالا۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ سیاست میں عورت کی شمولیت' سیاست کو شرافت آشنا کر دے گی۔ خیر یہ غلط فہمی جلد دور ہوگئی اور اب خواتین کی برتر شرافت کا کم ہی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ البتہ ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جو راہبوں کے اس نظریئے کے حامی ہیں کہ عورت ترغیب و تحریص کا آلہ ہے۔ اپنی جگہ خواتین اپنے آپ کو معقول جنس قرار دیتی ہیں۔ جس کا منصب یہ ہے کہ وہ اس اذیت رمصیبت کا قلع قمع کرے جو مردوں کی خامکار جلد بازی سے وجود میں آتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں عورتوں کے متعلق ان تمام عمومی تصورات سے اباء کرتا ہوں۔ یہ نظریات خواہ وہ ان کے حق میں ہوں یا مخالفانہ مردوں سے منسوب ہوں یا عورتوں سے، قدیم ہوں یا جدید سب کے سب میرے نزدیک تجربے کی خامی کا نتیجہ ہیں۔

ہر دو جنسوں کا عورت کے متعلق انتہائی غیر دانشمندانہ رویہ ناولوں اور بالخصوص گھٹیا ناولوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مردوں کے لکھے ہوئے گھٹیا ناولوں میں عورت کا تصور کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ مرد اس سے محبت کرتا ہے۔ عورت میں حسن و رعنائی کی تمامتر دلکشی موجود ہوتی ہے تاہم وہ بیچاری بے بس ہے۔ اور اسے مرد محافظ کی ضرورت رہتی ہے۔ بعض

اوقات وہ شیکسپیئر کی قلوپطرہ کی طرح پر جوش نفرت کا شکار ہوتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ سرتا سربدی کا پیکر ہے۔ اپنی ہیروئن کی تصویر کشی کرتے وقت مرد مصنف مشاہدے سے کام نہیں لیتا۔ وہ تو صرف اپنے جذبات کی ضرورت کے مطابق ایک تصویر بنا لیتا ہے۔ البتہ دوسرے نسوانی کرداروں کے متعلق اس کا نکتہ نظر معروضی ہوتا ہے۔ مشاہدے کے نقوش سے مزین۔ لیکن جہاں معاملہ عشق و محبت کا ہو وہاں اس کی وفا پرستی ایک دھند بن کر اس کے اور اس کی محبوبہ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ ناول نگار خواتین کے ہاں بھی عورت کے دو روپ ملتے ہیں۔ ایک تو ان میں سے وہ خود ہوتی ہیں۔ دولت حسن سے مالا مال اور فطرتاً نرم خو؛ شہوت پرستوں کے نزدیک صرف ایک آلہ عیش۔ لیکن اچھے لوگوں کے لئے مطلوب تمنا' زود حس' باوقار' جسے ہمیشہ غلط سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے گروہ میں ہر قسم کی عورتیں شامل ہوتی ہیں جنہیں بالعموم کمتر' منتقم مزاج' ظالم' جفا جو اور فریب کار دکھایا جاتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ تعصب سے بری ہو کر عورت کی صحیح اندازہ دانی مرد کے لئے ممکن نہیں ہے نہ عورت کے لئے۔

اسی طرح قومی خصوصیات کے متعلق مفروضے بھی بالکل بے سروپا ہوتے ہیں۔ 1870ء تک جرمنوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ دانا و بینا اساتذہ کی ایک قوم ہے جو ہر چیز اپنے باطنی شعور سے حاصل کرتے ہیں اور بیرونی دنیا سے کم و بیش بے نیاز ہیں۔ لیکن 1870ء کے بعد یہ تصور بدلنا پڑا۔ امریکنوں کی بڑی تعداد یہی سمجھتی ہے کہ فرانسیسی ہمہ وقت عیش پرستی میں مگن رہتے ہیں۔ والٹ وہٹمین ایک جگہ کہتا ہے ''زانی فرانسیسی جوڑا۔ عیاری کے پلنگ پر'' لیکن جو امریکی فرانس میں بودوباش اختیار کرتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ یا شاید مایوس ہو جاتے ہیں یہ دیکھ کر کہ فرانس میں خاندانی رشتوں کو بہت فروغ حاصل ہے۔ روسی انقلاب سے پہلے روسیوں کو ایک ایسی ''سلاو'' ذہنیت سے سرفراز کیا جاتا تھا جو اگرچہ ان کے معمول کے کاروبار زیست میں تو مددگار ثابت نہیں ہوتی تھی پھر بھی انہیں ایک گہری دانائی عطا کرتی تھی جو دوسری سرگرم عمل قوموں کے ہاں مفقود تھی۔ تاہم اچانک سب کچھ بدل گیا۔ تصوف ممنوع قرار پایا اور صرف ارضی آورش ہی قابل برداشت رہ گئے۔ اصل بات یوں ہے کہ جو ایک قوم کو دوسروں کے ہاں قومی خصوصیت نظر آتی ہے وہ صرف اس قوم کے چند سرکردہ اشخاص اور اس جماعت کا جو برسراقتدار ہو؛ ایک عکس ہوتا ہے۔ چنانچہ جونہی

کوئی اہم سیاسی تبدیلی آتی ہے تو یہ عمومی تصورات پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

ان حماقتوں سے بچنے کے لئے جن کی نوع انسان عموماً شکار ہو جاتی ہے کسی مافوق البشر کی ضرورت نہیں۔ چند سیدھے سادے اصول آپ کو تمام نہیں تو زیادہ بیہودہ حماقتوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

اگر معاملہ کچھ ایسا ہے کہ اس کا تعلق مشاہدے سے ہے تو پھر دوسروں کی بجائے اپنے ذاتی مشاہدے سے کام لیجئے۔ مثلاً اگر ارسطو نے صرف اتنی زحمت گوارا کر لی ہوتی کہ اپنی بیگم کا منہ کھلوا کر اس کے دانت گن لئے ہوتے تو یہ غلطی کبھی نہ کرتا کہ عورتوں کے دانتوں کی تعداد مردوں سے کم ہوتی ہے۔ جاننے کا دعویٰ کرنا حالانکہ حقیقت میں آپ کچھ بھی نہ جانتے ہوں (آنرا کہ بداند کہ داند نداند) سب سے مہلک غلطی ہے۔ جس کا ہم سب اعادہ کرتے ہیں۔ مجھے بتایا جاتا ہے اور اس لئے میں مان لیتا ہوں کہ خار پشت کی خوراک بھونرے ہیں۔ لیکن اگر میں نے اس موضوع پر کوئی کتاب لکھنی ہوتی تو پھر میں ذاتی طور پر جب تک خار پشت کو یہ بدذائقہ غذا کھاتے ہوئے نہ دیکھ لیتا کبھی اس کی تصدیق نہ کرتا۔ ظاہر ہے ارسطو زیادہ محتاط نہ تھا۔ قدیم اور عہد وسطیٰ کے مصنّفین' سینگ والے گھوڑے اور ''سلمنڈ'' (آگ کا کیڑا) کی حقیقت سے آگاہ نہ تھے۔ لیکن انہوں نے ان کے متعلق بے سروپا بیان دینے سے گریز نہ کیا حالانکہ انہوں نے ان کو دیکھا نہ تھا۔

بہت سے معاملات بڑی آسانی سے تجربے کی کسوٹی پر پرکھے جا سکتے ہیں۔ اگر عامۃ الناس کی طرح آپ بھی متعدد موضوعات کے متعلق پرجوش یقین کے حامل ہوں' تو اس کے لئے بھی کئی طریقے ہیں جن کے ذریعے آپ کو اپنے تعصّبات کی بے مائیگی کا باآسانی احساس ہو جائے گا۔ اگر آپ کی سوچ کے برعکس کوئی رائے آپ کو برافروختہ کر دیتی ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے تحت الشعور میں یہ بات موجود ہے کہ اپنی سوچ کے حق میں آپ کے پاس اچھے دلائل نہیں ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں یا یہ کہ آئس لینڈ' خط استواء پر واقع ہے تو آپ کو غصہ کی بجائے اس پر رحم آتا ہے۔ بشرطیکہ آپ کا ریاضی اور جغرافیہ کا علم اتنا کم مایہ نہ ہو کہ اس کی رائے آپ کے وثوق کو مسمار کر ڈالے۔ سب سے زیادہ وحشیانہ حد تک خطرناک تنازعات کا تعلق ایسے امور سے ہوتا ہے جن کے موافق یا مخالف قابل اعتماد شہادت موجود نہیں ہوتی۔ احتیاط کی ضرورت الہیات

میں ہوتی ہے نہ کہ ریاضی میں کیونکہ ریاضی تو مصدقہ علم ہے اور الہیات محض ظن وتخمین' چنانچہ اگر کہیں اختلاف رائے آپ کے لئے نا قابل برداشت ہو تو لازم ہے کہ احتیاط سے کام لیا جائے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جب آپ معاملے کا جائزہ لیں تو آپ پر واضح ہو جائے کہ آپ کا یقین جائز حدود سے متجاوز ہے۔

خاص قسم کے اذعانی نظریات سے گلو خلاصی کے لئے ایک اچھی ترکیب یہ ہے کہ سماجی اداروں میں آپ کے برعکس جن آراء کو پذیرائی ملی ہے۔ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ اپنے جوانی کے ایام میں بہت سا وقت میں نے اپنے ملک سے باہر فرانس' جرمنی' اٹلی' اور امریکہ میں بسر کیا۔ میں نے اپنی تنگ نظر تعصب سے رہائی پانے کے لئے اس نسخے کو بہت مفید پایا۔ اگر آپ ممالک غیر کا سفر اختیار نہیں کر سکتے تو کم از کم ایسے لوگوں سے ملئے جو آپ سے متفق الرائے نہیں۔ اور ان اخبارات کا مطالعہ کیجئے جو آپ کی مخالف جماعت کے ترجمان ہیں۔ اگر یہ اختلاف رکھنے والے لوگ اور اخبارات آپ کو یوں محسوس ہوں کہ سب کے سب وحشی بداطوار اور گمراہ ہیں تو جان لیجئے کہ وہ بھی آپ کے متعلق یہی رائے رکھتے ہوں گے۔ یوں تو ہوسکتا ہے کہ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ راستی پر ہوں لیکن دونوں بیک وقت غلط اندیش نہیں ہو سکتے یہ سوچ بچار یقیناً محتاط رویئے کو جنم دے گی۔

دوسروں کے رسم و رواج سے آ گاہی عموماً اچھے اثرات پیدا نہیں کرتی سترھویں صدی میں جب مانچو نے چین کو فتح کیا تو چین میں عورتوں کے پیروں کو چھوٹا رکھنے کا رواج تھا۔ اس کے برعکس مانچو مرد چوٹیاں رکھتے تھے۔ بجائے اس کے کہ دونوں اپنے اپنے احمقانہ رواج کو ترک کر دیتے دونوں نے ایک دوسرے کے رواج اپنا لئے۔ چنانچہ چینی مرد جب تک 1911ء میں مانچو تسلط سے آزاد نہیں ہو گئے برابر چوٹیاں رکھتے رہے۔

جو لوگ تخیل کی ذہنی استعداد سے مالا مال ہوتے ہیں ان کے لئے یہ ایک اچھا مشغلہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے جو ان کے برعکس خیالات کا حامل ہو' خیالی مناظرہ کریں۔ عملی مکالمے کے مقابلے میں اس طریق کار کو یہ تفوق اور بس یہی تفوق حاصل ہے کہ اس صورت میں زمانی اور مکانی حد بندیاں حائل نہیں ہوتیں۔ مہاتما گاندھی ریل گاڑی' دخانی کشتی اور ہر طرح کی مشینوں سے نالاں تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو صنعتی انقلاب کا نام ونشان مٹا دیتا۔ آپ کے لئے ان خیالات کے حامل کسی شخص سے ملاقات کا امکان موجود

نہیں ہے۔ کیونکہ مغربی ممالک تو تکنیک کے فوائد کے معترف ہیں۔ لیکن یہ جاننے کے لئے کہ اس رائے عامہ سے آپ کا اتفاق کہاں تک جائز اور برحق ہے ایک عمدہ طریق کار یہ ہے کہ آپ ان تمام دلائل کو ذہن میں لائیں جو آپ کے خیال میں گاندھی ان کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ اور پھر انہیں دوسرے دلائل سے رد کرتے چلے جائیں۔ میں نے تو بعض اوقات اس طریق کار کے استعمال سے اپنی آراء ہی کو بدل لیا ہے اور اگر نوبت یہاں تک نہ بھی پہنچی ہو تو جب میں اپنے فرضی مخالف کے دلائل کی معقولیت پر غور کرتا ہوں تو کم از کم میرے کٹر پن اور بڑھتے ہوئے تیقن میں لازماً نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔

ان آراء سے بہت زیادہ محتاط رہنا چاہئے جو آپ کے ذاتی تفاخر کو مہمیز کرتی ہوں۔ دس میں سے نو مرد اور خواتین اپنی صنف کی برتری کے متعلق یقین واثق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں طرف وافر مقدار میں ثبوت مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ مرد ہیں تو آپ اپنی جنس کے حق میں یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ بیشتر شعراء اور سائنس کے حکماء مرد ہوئے ہیں۔ اس کے جواب میں بحیثیت خاتون آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ مجرم بھی تو مرد ہی ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ بنیادی طور پر لاینحل ہے تاہم ذاتی تفاخر کی بنا پر لوگ اس بات کا اقرار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ہمارا تعلق دنیا کے کسی بھی خطے سے ہو اپنی اپنی جگہ ہم اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ ہماری قوم دوسری تمام قوموں سے ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر قوم کی اپنی اپنی مخصوص خوبیاں اور خرابیاں ہوتی ہیں ہم اپنے نظام اقدار کو اس طرح موافق یا مفید مطلب سانچے میں ڈھال لیتے ہیں، کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری قومی خوبیاں تو حقیقی اہمیت کی حامل ہیں جبکہ خرابیاں معمولی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں بھی ایک معقول شخص یہ بات مان لے گا کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی واضح صحیح جواب ممکن نہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت میں انسانی تفاخر کے مسئلے سے نپٹنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم کسی غیر انسانی مخلوق سے تو اس معاملہ پر بحث مباحثہ نہیں کر سکتے۔ اس عام انسانی خود پسندی سے عہدہ برآء ہونے کا میرے نزدیک صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسانی زندگی کائنات کے ایک چھوٹے سے کونے میں ایک چھوٹے سے سیارے پر وقوع پذیر ہونے والا ایک مختصر ترین حادثہ ہے۔ اور جو کچھ ہم جانتے ہیں اس کی رو سے ہو سکتا ہے کہ عالم کون و مکان کے دوسرے حصوں میں ایسی مخلوق موجود

ہو جسے ہم پر اسی نوع کی برتری حاصل ہو جیسی ہمیں جیلی فش پر حاصل ہے۔

خود پسندی کے علاوہ اور بھی کئی جذبے بالعموم غلطیوں کا سبب بنتے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین غالباً خوف ہے۔ بعض اوقات تو خوف براہ راست برسرِعمل ہوتا ہے۔ مثلاً جنگ کے دنوں میں تباہی و بربادی کے متعلق افواہ سازی' خوفناک مخلوق کے تصورات مثلاً جن بھوت پریت' اس کے برعکس بعض اوقات یہ بالواسطہ طریقے سے امید افزاء تصورات پیدا کر کے گمراہ کرتا ہے۔ مثلاً آپ حیات' یا اپنے لئے جنت اور اپنے اعداء کے لئے دوزخ۔ خوف کے بے شمار روپ ہیں۔ خوف مرگ' اندھیرے سے ڈرنا' غیب کا خوف' بھیڑ کا خوف' یا اپنے مخصوص خوفزدگی کے احساس کو اپنے آپ سے چھپانے کے نتیجے میں پیدا ہونے والا مبہم خوف۔ جب تک آپ خود اپنے ڈر اور خوف کا اقرار نہیں کر لیتے اور اپنے آپ کو ارادی محنت شاقہ سے اس کی فسانہ طرازی سے محفوظ نہیں کر لیتے اس وقت تک آپ بہت سے اہم مسائل کے متعلق حقیقی غوروخوض نہیں کر سکتے۔ بالخصوص ان امور کے متعلق جن کا تعلق مذہبی عقائد سے ہے۔ خوف ہی توہمات کی بنیادی وجہ ہے۔ اور ظلم و تعدی کے بنیادی اسباب میں سے ایک خوف پر غلبہ حاصل کر لینا ہی دراصل صداقت کی تلاش اور ایک باوقار طرز زندگی کے لئے تگ و تاز کی دانشمندانہ ابتداء ہوتی ہے۔

خوف سے بچنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو یہ وثوق کہ ہم تباہی و بربادی سے مامون و محفوظ ہیں۔ دوسرے یہ کہ حقیقی جرات سے کام لیا جائے۔ دوسرے طریقے پر عمل مشکل ہے۔ بلکہ ایک خاص مقام پر پہنچ کر تو یہ ہر ایک کے لئے ناقابل عمل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے زیادہ تر پہلے طریق کار ہی کو اپنایا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں جادو کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیں محفوظ رکھے۔ اس مقصد کے لئے یا تو دشمنوں کو نقصان پہنچایا جاتا تھا۔ یا اپنے آپ کو تعویذ گنڈوں کے ذریعے محفوظ کیا جاتا تھا یا تعویذ گنڈوں اور جنتر منتر سے اپنی حفاظت کی جاتی تھی۔ کسی خاص تغیر و تبدل کے بغیر خطرے سے بچنے کے لئے ان ذرائع پر اعتقاد۔ بابلی تہذیب کی صدیوں پر پھیلی ہوئی روایت میں جاری و ساری رہا۔ اور پھر بابل سے باہر نکل کر سکندر اعظم کے تمام مفتوحہ علاقوں میں پھیل گیا اور یہیں سے اہل روما نے اسے ہیلینی ثقافت کو قبول کرنے کے دوران اخذ کیا۔ روما سے اس نے قرون وسطیٰ کی عیسائیت اور اسلام میں نفوذ کیا۔ سائنس نے اب جادو میں اعتقاد کو کم کر دیا ہے۔ تاہم اب

بھی بہت سے لوگ سعد اور نحس پر یقین رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس کا اقرار نہیں کرتے اور جادو گری کو تو آج بھی قانون ایک ممکنہ ''جرم'' کی حیثیت سے مانتا ہے۔

جادو اصل میں خوف سے بچنے کا ایک ناپختہ طریقہ ہے۔ اور یہ کچھ ایسا کامیاب بھی نہیں کہ خبیث سفلی جادوگر عموماً نیک نہاد علوی جادوگروں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدی میں جادوگرنیوں اور ٹونہ ٹوٹکا کرنے والوں کے خوف سے ان جرائم کے مرتکب ہزاروں لاکھوں افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ تاہم بعض نئے اعتقادات خصوصاً آخرت پر یقین نے خوف سے چھٹکارا حاصل کرنے کے نسبتاً بہتر ذرائع اختیار کئے۔ سقراط نے بقول افلاطون' اپنی وفات کے دن کہا تھا کہ اسے یقین ہے کہ دوسری دنیا میں دیوتاؤں اور قومی اکابرین کے ساتھ زندگی بسر کرے گا اور اس کے گردان مبارک روحوں کا جمگھٹا ہو گا جو کبھی اس کے طویل دلائل کے خلاف ردعمل کا اظہار نہیں کریں گی۔ ارسطو نے اپنی جمہوریہ میں یہ اصول قائم کیا تھا کہ حکومت کو اخروی زندگی کے متعلق خوش آئند خیالات/توقعات کو رواج دینا چاہئے۔ اس لئے نہیں کہ وہ مبنی برحقیقت ہوتے ہیں بلکہ سپاہیوں کو میدان جنگ میں لڑ مرنے پر آمادہ کرنے کے لئے۔ وہ دوزخ کے متعلق روایتی داستانوں کو قبول نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ ان میں مرنے والوں کو بُرے حالوں دکھایا جاتا تھا۔

صحیح العقیدہ عیسائیت نے ایمان افروز زمانوں میں نجات اخروی کے واضح قوانین وضع کر دیئے تھے۔ سب سے پہلے اصطباغ کی شرط تھی اس کے بعد آپ کے لئے سب مذہبی محرمات سے پرہیز ضروری تھا۔ آخر میں مرنے سے پہلے توبہ اور گناہوں سے برات حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ آپ کو صرف اعراف میں محفوظ نہیں رکھیں گے بلکہ بالآخر آپ کے جنت میں داخلے کو بھی یقینی بنا دیں گے۔ اس مقصد کے لئے علم الٰہیات کے حصول کی ضرورت نہ تھی۔ ایک بڑے معتبر عالم دین نے بڑے وثوق کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ مذہب کے تمام تقاضے صرف اس عمل سے پورے ہو جاتے ہیں کہ مرنے والا دم واپسیں یہ اقرار کر لے کہ وہ ان سب باتوں پر یقین رکھتا ہے جن کی مذہب تلقین کرتا ہے اور یہ کہ اس کے تمام اعتقادات مذہبی توثیق کے حامل ہیں۔ ان واضح احکام نے راسخ العقیدہ عیسائیوں کے لئے جنت کا داخلہ یقینی بنا دیا۔ تاہم جہنم کا خوف بھی بدستور موجود رہا۔ اسی خوف نے بعد میں جزا

وسزا کے قوانین میں بہت نرمی پیدا کر دی۔ جدید دور کے عیسائیوں کے اس عقیدے سے کہ سبھی لوگ جنت میں جائیں گے موت کے خوف کو ختم ہو جانا چاہئے۔ لیکن درحقیقت یہ جبلی خوف آسانی سے ختم ہونے والا نہیں۔ ایف۔ ڈبلیو۔ ایچ مائرز جس کو روحانیات نے حیات اخروی کا قائل بنا دیا تھا ایک عورت سے جس کی بیٹی مر گئی تھی پوچھا کہ وہ کیا سمجھتی ہے کہ اس کی بیٹی کی روح کا انجام کیا ہوا ہوگا۔ ماں نے جواب دیا کہ اس کا خیال ہے کہ اسے ابدی راحت نصیب ہوگی۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ اس طرح کی ناگوار باتوں کو نہ چھیڑیں تو بہتر ہے۔ مذہب کی تمام تر حوصلہ افزائیوں کے باوجود آخرت کا موضوع اکثر لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہے۔

مذہب کی لطیف تر صورتیں مثلاً مارکوس آریلیس اور سپنوزا کے مذہبی تصورات بھی خوف سے نبرد آزما ہیں۔ رواقیت کا نظریہ بہت سادہ تھا کہ حقیقی نیکی پرہیزگاری ہے جسے کوئی دشمن چھین نہیں سکتا۔ نتیجتاً دشمنوں سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اصل مشکل تو یہ ہے کہ کوئی شخص بھی صرف پرہیزگاری کو نیکی شمار کرنے پر آمادہ نہیں۔ حتیٰ کہ مارکوس آریلیس بھی اس کا قائل نہیں............ اس نے بادشاہ کی حیثیت میں اپنی رعایا کو نیکوکار اور پرہیزگار بنانے کے علاوہ انہیں وحشیوں کے حملوں، وباؤں اور قحط سالی سے بچانے کی تدبیریں بھی کی تھیں۔ سپنوزا نے بھی کچھ ایسی ہی تعلیم دی تھی۔ اس کے نزدیک بھی نیکوکاری دراصل دنیوی آسائشوں سے بے اعتنائی کا نام ہے۔ دراصل یہ دونوں منکر خوف اس سے رستگاری اس تجاہل میں تلاش کر رہے تھے کہ جسمانی تکالیف حقیقتاً شر نہیں ہیں خوف سے بچنے کا یہ ایک شریفانہ طریق ہے۔ اگرچہ اس کی بنیاد سرتا سر غلط عقیدے پر ہے۔ اور اگر اسے صحیح معنوں میں اختیار کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ صرف اپنی تکالیف سے بے اعتنائی برتنے کے علاوہ دوسروں کی زبوں حالی سے بھی لاپرواہ ہو جائیں گے۔

شدید خوف سے تقریباً ہر شخص وہمی ہو جاتا ہے۔ وہ ملاح جنہوں نے حضرت یونسؑ کو کشتی سے باہر پھینک دیا تھا' یہ سمجھتے تھے کہ ان کی موجودگی ہی طوفان کا سبب تھی جو ان کی کشتی کو ڈبو سکتا تھا۔ کچھ اسی قسم کے خوف کے زیر اثر جاپانیوں نے ٹوکیو میں زلزلے کے موقعہ پر کوریا کے باشندوں اور آزادی پسندوں کا قتل عام کیا تھا۔ جب اہل روما کو جنگ میں کامیابی حاصل ہو رہی تھی تو شکست خوردہ کارتھین باشندوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ

ان کی بدقسمتی کا سبب اصل میں یہ تھا کہ انہوں نے دیوتاؤں کی عبادت میں سستی دکھانی شروع کر دی تھی۔ دیوتا بچوں کی قربانی اور وہ بھی شرفاء کے بچوں کی قربانی کو پسند کرتے تھے۔ لیکن کارتھین کے شرفاء نے چالاکی سے یہ رسم اپنا لی تھی کہ وہ رعایا کے بچوں کو اپنے بچوں کی جگہ اپنی اولاد بنا لیتے تھے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اسی فریب کاری نے دیوتا کو غضبناک کر دیا تھا اور مشکل ترین لمحات میں تو اعلیٰ ترین نسب والے بچوں کو بھی بے دریغ آگ میں جھونک دیا گیا تھا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ اس جمہوریت پسندانہ اصلاح احوال کے بعد بھی فتح اہل روما ہی کا مقدر بنی۔

اجتماعی خوف گروہی جبلت کو مہمیز کرتا ہے اور ان لوگوں کے خلاف جوش و جذبہ کو ابھارتا ہے جنہیں گروہ کا فرد نہیں سمجھا جاتا۔ انقلاب فرانس کے دوران یہی کچھ ہوا تھا جب بیرونی حملہ آور فوجوں کے خوف نے دہشت گردی کو ہوا دی تھی۔ سوویت حکومت اتنی فتنہ خو نہ ہوتی اگر آغاز میں اسے کم تر مخالفت سے پالا پڑا ہوتا۔ خوف ہی ظالمانہ جذبوں کو جنم دیتا ہے اور اس لئے اس طرح کے توہمات کو ہوا دیتا ہے جو ظلم کا جواز بنتے ہیں۔ شدید خوف کی حالت میں کوئی فرد' کوئی گروہ' کوئی قوم بھی نرم خوئی سے کام نہیں لے سکتی نہ اس کی سوچوں میں معقولیت فروغ پا سکتی ہے۔ اسی وجہ سے بزدل لوگ بہادروں کے مقابلے میں زیادہ ظالم ہوتے ہیں۔ جب میں یہ بات کہتا ہوں تو میرے ذہن میں ایک ایسے شخص کا تصور ہے جو ہر لحاظ سے دلیر ہو' نہ کہ صرف موت کا سامنا کرنے کے معاملے میں۔ بہت سے لوگ دلیرانہ موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ لیکن ان میں یہ جرات نہیں ہوتی کہ اس مقصد کے متعلق جس کے لئے وہ جان دے رہے ہوں، یہ کہنے یا سوچنے پر آمادہ ہوں کہ وہ لغو یا بیہودہ ہے' بعض لوگوں کے لئے مخالفانہ رد و قدح موت سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اجتماعی جوش و خروش کے دوران بہت ہی کم لوگ رائے عامہ سے اختلاف کی جرات کرتے ہیں۔ کسی کارتھین میں دیوتا سے منحرف ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ کیونکہ اس مقصد کے لئے میدان جنگ میں موت کو گلے لگانے کے مقابلہ میں زیادہ ہمت و جرات کی ضرورت تھی۔

لیکن ہم شاید کچھ زیادتی کر رہے ہیں۔ توہمات ہمیشہ اندھے اور ظالم ہی نہیں اکثر اوقات یہ زندگی کی گہما گہمی میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے ایک دیوتا کا پیغام ملا۔ اس نے مجھے اپنا ٹیلیفون نمبر بھی دیا ان دونوں وہ بوسٹن کے نواح میں رہتا تھا۔ میں اس کے

پجاریوں میں تو شامل نہیں ہوا۔ تاہم اس کے خط ملنے پر مجھے خوشی ہوئی۔ مجھے کئی دفعہ ایسے لوگوں کے خطوط موصول ہوئے ہیں جو مسیح ہونے کے دعویدار تھے اور مجھے تاکید کی کہ اس اہم بات کا ذکر میں اپنے لیکچروں میں ضرور کروں۔ شراب بندی کے زمانے میں امریکہ میں ایک فرقہ ایسا تھا جن کا عقیدہ یہ تھا کہ عشائے ربانی کے تہوار میں وہسکی استعمال ہونی چاہئے نہ کہ انگوری شراب۔ اس طرح انہیں تیز شراب استعمال کرنے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ اس فرقے کو بہت فروغ نصیب ہوا۔ انگلینڈ میں ایک فرقہ اس امر کا دعویدار ہے کہ انگریز ہی بنی اسرائیل کے گمشدہ قبائل ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ صرف وہی افراہیم کی اولاد ہیں۔ جب بھی میں ان میں سے کسی ایک فرقے کے شخص سے ملتا ہوں تو میں یہ ظاہر کرتا ہوں کہ میں دوسرے فرقے کا پیروکار ہوں۔ پھر بڑی دلچسپ بحثیں چھڑ جاتی ہیں۔ میں ان لوگوں کو بھی بہت پسند کرتا ہوں جو عظیم اہرام کا اس لئے مطالعہ کرتے ہیں کہ اس سے متعلق مخصوص پراسرار روایات کا سراغ لگا سکیں۔ اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سے بعض خود ان کے مصنّفین نے مجھے عنایت کی تھیں۔ ان سب میں مشترکہ نکتہ یہ ہوتا ہے کہ اہرام اس کتاب کی اشاعت تک آئندہ کی تاریخ کا معتبر ترین ذریعہ ہیں۔ لیکن اس کے بعد پیشنگوئی کی صحت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ بالعموم ان مصنّفین کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ مصر میں جلد ہی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جن کے آخر میں مہدی اور مسیح موعود ظہور کریں گے۔ لیکن اب تک کتنے ہی لوگ مسیح موعود بن کر آئے ہیں کہ قارئین مجبوراً ان قصوں پر شک کرنے لگے ہیں۔

مجھے وہ کاہنہ بہت پسند تھی جو ایک جھیل کے کنارے 1820ء کے لگ بھگ نیویارک سٹیٹ میں رہتی تھی۔ اس نے اپنے پیروکاروں کو یقین دلایا تھا کہ اسے پانی پر چلنے کا ملکہ حاصل ہے۔ اور یہ کہ وہ ایک صبح 11 بجے اس کا مظاہرہ کرے گی۔ مقررہ وقت پر ہزاروں لاکھوں عقیدت مند اکٹھے ہو گئے۔ اس نے ان سے سوال کیا کہ کیا انہیں واقعی یقین ہے کہ وہ پانی پر چل سکتی ہے تو انہوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ وہ مانتے ہیں۔ چنانچہ کاہنہ نے اعلان کیا کہ پھر اسے مظاہرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ گھروں کو لوٹ گئے۔ ان کے ایمان میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ دنیا کی دلچسپیوں اور تنوع میں شاید کچھ نقص واقع ہو جائے گا اگر اس قسم کے اوہام کی جگہ خشک سائنسی معلومات کو دے دی جائے۔ اس حال میں

تو ہمیں ان ناخواندگان پر شاید رشک آئے گا جنھوں نے تمام علوم کو سفلی قرار دے کر رد کر دیا تھا اور اسی لئے ابجد سیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ جنوبی امریکہ کے رہنے والوں کا یہ استعجاب بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کہ درختوں پر پائے جانے والے سست رو حشرات کس طرح بچتے بچاتے طوفان نوح کے بعد کوہ اراکان سے پیرو تک پہنچ گئے۔ اتنا طویل سفر اتنی انتہائی سست روی کے باعث ناقابل یقین نظر آتا ہے۔ عقلمند آدمی تو وہ ہے جو اللہ کی وافر نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہے اور دانش کے کباڑ خانے سے اسے آج بھی وافر مقدار میں نعمتیں ارزانی ہوتی رہتی ہیں۔

ایک فلسفی کا دہشت ناک خواب

میرا دوست بیچارہ آندری بمبلوسکی (ANDREI BUMBLOWSKY) پہلے وسطی یورپ کی ایک یونیورسٹی میں جواب موجود نہیں ہے، فلسفہ کا پروفیسر تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک بے ضرر قسم کے مالیخولیا میں مبتلا ہے۔ میں خود بھی فہم و فراست کا مالک ہوں ایک صحیح الفہم شخص ہوں میرا خیال ہے کہ دانشوری کو امور زیست میں رہبر نہیں بنانا چاہئے۔ البتہ دل بہلاوے کے لئے حجت بازی کے مشاغل یا اپنے مقابلے میں کم تر ذہین (غبی یا پھسڈی) حریفوں کو زچ کرنے کے لئے اس کا استعمال جائز ہے۔ بمبلوسکی اس رائے کا حامی نہیں تھا۔ اس نے اپنی دانشوری کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی تھی کہ جہاں چاہے اسے لئے پھرے۔ نتیجہ خرابیٔ بسیار۔ وہ بحث مباحثہ کم ہی کرتا تھا۔ اس لئے اس کے بہت سے احباب کے لئے اس کی آراء اس کے موقف کی وجوہات نا قابل فہم ہی رہیں۔ جو بات سب جانتے تھے وہ یہ تھی کہ وہ کلمہ نفی یعنی ''نہیں'' کے استعمال سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ یہ کہنے کی بجائے کہ یہ انڈہ تازہ نہیں ہے۔ وہ یوں کہنے کا عادی تھا اس انڈے میں کیمیائی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ اگر یہ کہنا ہوتا کہ مجھے ''فلاں کتاب نہیں مل رہی'' تو اس مفہوم کے لئے وہ کچھ اس قسم کا جملہ استعمال کرتا۔ ''مجھے فلاں کتاب کے علاوہ دوسری کتابیں ملی ہیں۔'' اس کی زندگی عمل سے تہی تھی، لیکن تھا وہ بالکل فرشتہ سیرت سیدھا سادہ مجھے اس سے بہت تعلق خاطر تھا اور اسی چیز نے اسے لب کشائی پر مائل کیا اور اس نے ذیل کا نہایت دلچسپ تجربہ بیان کیا جسے میں اسی کے الفاظ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

ایک دفعہ مجھے شدید بخار نے آ لیا اور میں مرتے مرتے بچا۔ اس دوران مجھ پر مسلسل

ایک ہذیانی کیفیت طاری رہی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دوزخ میں ہوں۔ دوزخ ایک ایسا مقام ہے جہاں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو غیر معمولی یا خلاف معمول تو ہوتے ہیں لیکن ناممکن نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان سے عجیب و غریب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کچھ مغضوب لوگ جب پہلے پہل یہاں پہنچتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں کہ ہمیشگی کی اکتاہٹ سے تاش کھیل کر چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ جب بھی وہ تاش کے پتوں کو پھینٹتے ہیں تو وہ از خود حکم کے یکہ سے لے کر پان کے بادشاہ تک اپنی اصلی ترتیب اختیار کر لیتے ہیں۔ دوزخ میں ممکنات یا اعتبارات کے طلبہ کے لئے ایک الگ حصہ مخصوص ہے۔ یہاں بہت سے ٹائپ رائٹر اور بہت سے بندر نظر آتے ہیں۔ جب بھی کوئی بندر کسی ٹائپ رائٹر پر سے گزرتا یا ٹائپ رائٹر سے اٹھکیلیاں کرتا ہے تو اتفاق دیکھئے کہ ٹائپ رائٹر کھٹا کھٹ شیکسپیئر کی کوئی سانیٹ ٹائپ کر دیتا ہے۔ رہے ماہر طبیعیات تو ان کی عذاب گاہ جدا واقع ہے۔ یہاں چولہے جلتے رہتے ہیں اور بہت سی کیتلیاں بھی موجود ہیں لیکن جب کیتلیوں کو چولہوں پر چڑھایا جاتا ہے تو پانی ان کے اندر یخ بستہ ہو جاتا ہے۔ یہاں کچھ ایسے کمرے بھی ہیں جن میں بہت گھٹن ہے لیکن اب ماہرین طبیعیات تجربے سے جان گئے ہیں کہ کھڑکیوں کو ہرگز نہیں کھولنا چاہئے کیونکہ جب بھی کھڑکیاں کھلتی ہیں تو کمروں کے اندر کی ساری ہوا باہر نکل جاتی ہے اور کمرے کے اندر خلا پیدا ہو جاتا ہے۔

کھانے پینے کے شوقین لوگوں کا مقام الگ ہے۔ انہیں کھانا پکانے کے لئے بہترین مسالے اور ماہر ترین باورچی میسر ہیں لیکن جب انہیں بھنا ہوا گوشت پیش کیا جاتا ہے اور وہ کمال اشتیاق سے ایک بڑا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہیں تو انہیں اس کا مزا خراب انڈے جیسا لگتا ہے۔ اور جب وہ انڈا منہ میں ڈالتے ہیں تو اس کا مزہ گلے سڑے آلو جیسے ہوتا ہے۔

ایک نہایت اذیت ناک ایوان ان فلسفیوں کے لئے مختص ہے جنہوں نے ہیوم کا انکار کیا تھا ان فلسفیوں کو دوزخ میں پہنچ کر بھی عقل نہیں آئی۔ وہ اب بھی اپنی حیوانی اڑیل فطرت سے مجبور استقرائی منطق کی حمایت میں سرگرم ہیں لیکن جب بھی وہ کوئی استقرائی دلیل (مقدمہ) قائم کرتے ہیں تو دوسرے ہی لمحے اس کا ابطال ہو جاتا ہے۔ اس کے ابطال کا کوئی پہلو نکل آتا ہے لیکن یہ معاملہ صرف عذاب کی پہلی صدی میں پیش آتا ہے۔ کیونکہ اب وہ تجربے کی بنا پر پہلے ہی سے ہر استقرائی دلیل کے ابطال کے منتظر رہتے ہیں۔

چنانچہ یہ ابطال ایک صدی تک کے لئے التواء میں ڈال دیا جاتا ہے تا آنکہ منطقی کھینچا تانی میں ایک اور صدی گزارنے کے بعد ان کی توقع کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اس طرح تحیّر تا بہ ابد قائم رہتا ہے لیکن ہر لحظہ اس کا منطقی مقام بلند تر ہوتا رہتا ہے۔

پھر خطیبوں کی عقوبت گاہ ہے جو اپنی ارضی زندگی میں اپنی فصاحت سے بڑے بڑے مجمعوں کو مسحور کرنے کے عادی رہے ہیں ان کی فصاحت تو بدستور قائم ہے اور مجمعے بھی موجود ہیں لیکن عجیب طرح کی ہوائیں ان کی آواز کو اس طرح منتشر کر دیتی ہیں کہ جب وہ مجمعے تک پہنچتی ہیں تو خطیب کی منہ سے نکلی ہوئی آوازوں کی بجائے بوجھل فرسودہ ڈھکوسلوں میں ڈھل جاتی ہیں۔

دوزخ کے عین وسط میں ابلیس متمکن ہے۔ اس کے حضور صرف چیدہ چیدہ گنہگاروں ہی کی رسائی ہوتی ہے۔ شیطان سے جتنے قریب ہوتے جائیں عدم تعینات کا احساس اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے اور خود اس کا وجود عدم تعین کی مکمل ترین صورت ہے۔ وہ کیا ہے، نفی محض، مکمل عدم وجود تاہم لحہ بہ لحہ تغیر پذیر۔

مجھے اپنی فلسفہ دانی کی وجہ سے بہت جلد شاہ ظلمات کی پیشی نصیب ہوگئی ۔ یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ شیطان مطلق نفی ہے لیکن اس کے حضور پہنچ کر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ابلیس کا جسم بھی نفی ہے اور ذہن بھی نفی۔ اس کا جسم دراصل ایک خالص اور کامل ترین خلاء ہے جس میں صرف یہ نہیں کہ جامد مادے کے ذرات نہیں بلکہ روشنی (نور) کا بھی گزر ممکن نہیں۔ اس کے خلاء کو تسلسل عدم تعین پر منتج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی ذرہ وجود اس کی خارجی سطح کے قریب پہنچ ہی جائے تو اتفاق سے کسی دوسرے ذرے سے ٹکرا جاتا ہے اور یوں خلاء تک پہنچنے کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے۔ یہ خلاء چونکہ یہاں نور یا روشنی کا گزر ممکن نہیں بالکل تیرہ و تار ہے ان چیزوں کے برعکس جنہیں ہم یہاں تاریک یا سیاہ کہنے کے عادی ہیں یہاں کسی کمی بیشی کو دخل نہیں۔ یہ تو تمام تر، مکمل ترین، لامتناہی ظلمات ہے۔ تاہم اس کی ایک صورت بھی ہے۔ وہی جو ہم اس سے منسوب کرنے کے عادی ہیں۔ یعنی سینگ۔ سم، دم وغیرہ۔ باقی دوزخ سب کا سب ''گھٹا ٹوپ'' شعلوں کی آماجگاہ ہے۔ اور اس پس منظر پر شیطان اپنی مہیب شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ غیر متحرک نہیں۔ اس کے برعکس وہ خلاء جس سے اس کا وجود عبارت ہے مسلسل متحرک ہے۔ جب کوئی چیز اسے ناگوار

گزرتی ہےتو وہ اپنی لپٹی ہوئی دم کو سیدھا کرتا ہے اور ایک غصب ناک بلی کی طرح اسے لہرا کر دہشت پھیلا دیتا ہے۔ وہ نئی فتوحات کے لئے چل کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ چمکدار سفید زرہ بکتر پہن لیتا ہے جو اس کے باطنی خلاء کو مکمل طور پر ڈھانپ لیتا ہے۔ صرف اس کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں جہاں بھی اسے انکار' ممنوعات یا پابندیوں کی حکمرانی نظر آتی ہےتو وہ آنکھیں ان کے بطون میں جو انہیں قبول کرنے پر آمادہ ہوں، اترتی چلی جاتی ہیں کیونکہ انکار کا منبع وہی تو ہے اور پھر یہ مایوسیوں کی نئی فصل اکٹھی کر کے واپس لوٹتی ہیں۔ یہ جمع کی ہوئی مایوسیاں اس کے وجود کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اس کا وجود پھیلتا چلا جاتا ہے تاآنکہ یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ تمام موجودات پر چھا جائے گا۔ ہر وہ اخلاقی معلم جس کا نظریہ اخلاق نور پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر وہ بزدل شخص جو جرات کے فقدان کو ارادے پر حاوی ہونے کی اجازت دیتا ہے ہر وہ جابر حکمران جو اپنی رعایا پر خوف مسلط کئے رکھتا ہے وقت آنے پر شیطان کے وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے گرد چرب زبان فلسفیوں کا جمگھٹا رہتا ہے وہی جنہوں نے وحدت الوجود کی جگہ کثرت (زندقہ) کو رواج دیا ہے ان لوگوں کا دعوئ ہے کہ موجودات فریب محض ہیں۔ نیستی (عدم وجود) ہی اصل حقیقت ہے انہیں امید ہے کہ وقت آنے پر وہ موجودات کے عدم وجود کو الم نشرح کر دیں گے اور اس لمحے ہر وہ چیز جسے ہم وجود سمجھتے ہیں وہ کثرت کے جوہر کے بیرونی خول کا ایک حصہ نظر آنے لگے گی۔ اگرچہ ان فلسفیوں نے بہت باریک بینی سے کام لیا ہے تاہم میں ان سے متفق نہ ہو سکا میں جب تک زمین پر رہا میں نے ہر جابرانہ تحکم کی مخالفت کی اور اب دوزخ میں بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ میں نے چرب زبان فلسفیوں سے مباحثہ شروع کر دیا۔

میں نے اپنی دلیل یوں شروع کی ''تم جو کہہ رہے ہو وہ بالکل لغو ہے۔ تم یہ دعوئ کرتے ہو کہ نیستی ہی اصل حقیقت ہے' تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ قعر ظلمات جس کے تم پجاری ہو موجود ہے' تم مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ نیستی کا ہی وجود ہے لیکن تم نہیں جانتے کہ یہ تو اجتماع ضدین ہے اس کے اندر تو ایک تضاد موجود ہے اور دوزخ کے شعلے جتنا چاہیں بھڑکیں میں اپنے منطقی وجود کو اتنا گرا نہیں سکتا کہ ایک تضاد کو قبول کر لوں۔''

اس موقعہ پر چرب زبانوں کے صدر نے اپنی حجت شروع کی ''تم بہت جلد باز ہو' میرے دوست! تم نیستی کے وجود سے انکار کرتے ہو؟ لیکن یہ تو سوچو وہ ہے کیا جس کے

وجود سے تم انکار کر رہے ہو اگر نیستی کچھ بھی نہیں تو اس کے متعلق کوئی بھی بیان لغو ہو گا۔ چنانچہ یہی حال تمہارے اس دعویٰ کا ہے کہ یہ وجود نہیں رکھتی۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تم نے جملوں کے منطقی تجزیئے پر توجہ نہیں دی۔ اس امر کی تعلیم تو تمہیں بچپن ہی میں ملنی چاہئے تھی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہر جملہ کا ایک مسند علیہ ہوتا ہے اور اگر مسند علیہ کچھ بھی نہ ہو تو فقرہ بے معنی ہو گا۔ چنانچہ جب تم پورے جوش سے یہ اعلان کرتے ہو کہ شیطان ...... جو نیستی ہے، وجود نہیں رکھتا تو تم خود اپنی بات کو رد کر دیتے ہو۔

میں نے جواباً کہا ''تمہیں یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے اور وہی پرانے نظریئے سینے سے لگائے ہوئے ہو۔ چنانچہ یہ جو تم نے مسند علیہ کی بڑ ہانکی ہے اس کا تو اب چلن باقی نہیں رہا۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ شیطان جو نیستی ہے موجود نہیں ہے تو اصل میں میری مراد نہ شیطان سے ہوتی ہے نہ عدم وجود سے، بلکہ یہ تو صرف ''شیطان'' اور ''عدم وجود'' دو لفظوں کا قصہ ہے، اور بس۔ البتہ تمہاری غلط دلیلوں نے مجھے ایک عظیم حقیقت سے آشنا کرا دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ ''نہیں'' بے مصرف ہے۔ آج کے بعد میں اسے ہرگز استعمال نہیں کروں گا۔

اس پر وہ تمام فلسفی جو وہاں اکٹھے ہو گئے تھے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ''لو سنو! یہ شخص کس طرح اپنی نفی کر رہا ہے۔'' جب ہنسی کا دورہ ماند پڑا تو وہ کہنے لگے۔

''نفی سے احتراز کے حق میں اس نے جو فیصلہ کیا ہے ذرا اس پر تو غور کرو، آج کے بعد یہ شخص ''نہیں'' کا لفظ استعمال نہیں کرے گا۔''

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ میری جیب میں ایک لغت تھی۔ میں نے اس میں سے نفی کے سارے کلمے قلمزد کر دیئے اور کہا ''اب سے میری گفتگو میں صرف وہی لفظ استعمال ہوں گے جو اس لغت میں باقی بچ گئے ہیں۔ ان کی مدد سے میں کائنات میں جو کچھ ہے اسے مثبت طریقے سے بیان کر سکوں گا۔ میں بہت سے بیانات ترتیب دوں گا لیکن یہ سب کے سب شیطان کے علاوہ دوسری چیزوں کے متعلق ہوں گے۔ شیطان نے اس جہان عقوبت میں بہت عرصہ حکمرانی کر لی ہے۔ اس کا چمکتا ہوا زرہ بکتر ایک حقیقت تھی اور دہشت پھیلانے کا سبب لیکن اس کے نیچے صرف ایک غلط لسانی روایت کارفرما تھی اور دہشت پھیلانے کا موجب لیکن اس کے نیچے صرف ایک غلط لسانی روایت

کارفرما تھی۔ لفظ ''نہیں'' سے گریز کیجیے۔ اس کی مملکت از خود ختم ہو جائے گی۔''

جب یہ بحث چل رہی تھی' شیطان ہر لمحہ بڑھتے ہوئے غیظ و غضب سے اپنی دم کو لہراتا رہا اور تاریکی کی وحشتناک کرنیں اس کی آنکھوں کی گہرائی سے اڈی چلی آ رہی تھیں لیکن بالآخر جب میں نے غلط لسانی روایت کہہ کر اس کا ابطال کیا تو دوزخ میں ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ ہوا کے جھونکے ہر طرف سے اندر آنے لگے اور وہ خوفناک صورت غائب ہو گئی۔ دوزخ کی دھواں دھار فضا جو نیستی کی دبیز شعاعوں کی وجہ سے تھی یکدم جیسے جادو کے زور سے صاف ہو گئی۔ وہ جو ٹائپ رائٹروں پر بندر نظر آ رہے تھے اب اچانک ادبی نقاد دکھائی دینے لگے کیتلیوں میں پانی ابلنے لگا۔ تاش کے پتے آپس میں گڈ مڈ ہو گئے' کھڑکیوں سے تازہ ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے بھنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے اب واقعی بھنے ہوئے گوشت کا مزا دینے لگے۔ آزادی کے ایک عجیب تصور سے سرشار میں نیند سے بیدار ہوا۔ میں نے سوچا کہ بظاہر تو یہ ایک ہذیان تھا لیکن اصل میں میرا خواب دانش کا خزینہ ہے اس لمحے کے بعد بخار تو اتر گیا لیکن شاید آپ سوچتے ہوں کہ ہذیان اب بھی باقی ہے۔

☆☆☆

خوفزدگی سے آزادی

وہ سب سے اہم بات جو کہنے کے لئے اکثر سوچتا رہا ہوں یہ ہے کہ انسان نے نئی تکنیک سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ورنہ اس کے دانشمندانہ استعمال سے یہ ممکن تھا کہ وہ ان اندیشوں سے جن کا ماضی میں تو عقلی جواز موجود تھا نجات پا کر پُرمسرت زندگی بسر کر سکتا۔

خوفزدگی زندگی کے کم ازکم تین اہم شعبوں میں انسان کے کردار کو بری طرح متاثر کرتی ہے یعنی فطرت (فطری قوانین) کے متعلق اس کا رویہ۔ اپنے ہم جنسوں سے راہ و رسم اور خود اپنی ذات سے برتاؤ۔ میں یہاں ان طریقوں کا جائزہ لوں گا جن سے کام لیتے ہوئے دقیانوسی اندیشوں کے جبر سے آزاد ہو کر انسان اس دنیا کو زیادہ خوشگوار بنا سکتا ہے۔

ابتداء میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ''خوفزدگی'' اور ممکنہ خطرات کو عقلی طور پر بھانپ لینے سے پیدا ہونے والا اندیشہ' دو مختلف کیفیتیں ہیں۔ خطرات جب بالفعل موجود ہوں تو ان سے آنکھیں بن کر لینا یقیناً حماقت ہو گی لیکن اہم بات یہ ہے کہ کسی خطرے کا سدباب' خوفزدگی سے ممکن نہیں۔ یہ فریضہ تو صرف عقل و شعور ہی بطریق احسن سرانجام دے سکتے۔ ''خوفزدگی'' تو انسان اور دیگر حیوانات کا مشترکہ ردعمل ہے۔ یہ ایک خام اور بے ہنگم قسم کا ردعمل ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض اوقات یہ تحفظ ذات میں ممد ثابت ہوتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس میں ضرر رسانی کا بھی اتنا ہی امکان ہوتا ہے۔ جو آدمی خوفزدگی کا شکار نہ ہو وہ بہتر طور پر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ خطرے سے نبٹنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ خوفزدگی بعض اوقات لوگوں کو خطرے کے وجود سے آنکھیں بند کر لینے کا درس دیتی ہے۔ وہ جانتے بوجھتے بھی خطرے کا اقرار نہیں کرتے اور اس طرح ان احتیاطی تدابیر کو بھی بروئے کار نہیں

لاتے جن کا عقلمندی تقاضا کرتی ہے کئی دفعہ تو یہ مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً موت ایک اٹل حقیقت ہے لیکن موت کا خوف کبھی کبھی آدمی کو وصیت کرنے سے روکتا ہے۔ اس امر کی تصریح بہت ضروری ہے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ خوفزدگی کی مخالفت سے مراد حقیقی خطرات کے واضح تعقل کی مخالفت ہے۔

مختلف قسم کے خطرات سے نبٹنے کے لئے ذرائع بھی کئی قسم کے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ فطرت، طبیعی امور انسان پر کچھ پابندیاں کرتے ہیں۔ یہ پابندیاں بہت حد تک ناگزیر ہوتی ہیں اور اسی حد تک انہیں قبول کرنا بھی لازم ہے۔ اس کے برعکس انسانی بہبود کی راہ میں جو رکاوٹیں باہمی تعلقات یا اپنے تصور ذات سے پیدا ہوتی ہیں ان سے بڑی حد تک گریز کیا جا سکتا ہے۔ انسان ایک دوسرے کے لئے نفرت یا بدخواہی سے جو مصیبتیں کھڑی کر لیتے ہیں یا احساس جرم کے ماتحت اپنے آپ کو جس اذیت میں مبتلا رکھتے ہیں اس سے تو بہرحال بچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ مختلف نوعیت کی خرابیوں کے سدباب کے لئے اقدامات کی نوعیت بھی مختلف ہوگی۔

فطرت کی طرف سے عائد کردہ مجبوریوں کا تعلق خوراک، خام مواد اور موت جیسے طبیعی امور سے ہے۔ خوراک اور خام مواد کی پابندیاں مطلق حیثیت نہیں رکھتیں۔ زیادہ محنت سے زیادہ خوراک پیدا کی جا سکتی ہے اور بہتر طریق کار سے خام مواد کے استعمال میں بچت کی جا سکتی ہے۔ یا جن چیزوں کو اب تک بے مصرف سمجھا جاتا تھا ان سے کام لیا جا سکتا ہے اسی طرح موت کو بھی دوا دارو اور دانشمندانہ طرز زندگی سے وقتی طور پر ٹالا جا سکتا ہے تاہم ان تینوں صورتوں میں امکانات کی کوئی خاص حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ پابندیاں بہرحال موجود رہیں گی دوا کسی طور پر بھی انسان کو غیرفانی نہیں بنا سکتی اور اگر زمین پر انسانی آبادی کے لئے صرف پاؤں رکھنے ہی کی گنجائش باقی رہ جائے تو پھر سائنس کتنی بھی ترقی کر جائے خوراک کہاں سے مہیا کرے گی۔

فطرت کی طرف سے عائد کردہ ان پابندیوں سے صرف سائنسی طریق کار ہی سے اس طرح نپٹا جا سکتا ہے کہ کم سے کم زحمت سے پالا پڑے۔ خوراک کے مسئلے کا حل برتھ کنٹرول ہے۔ خام مواد کے معاملے میں بہتر ٹیکنیک اور بین الاقوامی سطح پر ضیاع کو روکنے اور منصفانہ تقسیم کے ذریعے مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے موت کا التواء طب کا مسئلہ ہے لیکن موت

کے بھوت کو سر پر سوار کیئے رکھنا ایک نفسیاتی الجھن ہے جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

ماضی میں فطری حدود قیود کا مقابلہ اوہام سے کیا جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ دیوی دیوتا' شیاطین اور جادوگر جو ارواح خبیثہ کو مدد پر آمادہ کر سکتے تھے اگر ناراض ہو جائیں تو موسم خراب ہو جاتا ہے۔ آج بھی آبائے کلیسا یہی کہتے ہیں کہ خشک سالی یا کثرت باراں کا دفعیہ دعاؤں ہی سے ہو سکتا ہے۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ اوہام پرستی کے ہتھکنڈے الٹے پڑ جاتے اور شر میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً قرون وسطیٰ میں اگر کہیں طاعون پھیل جاتا تو لوگوں کو گرجوں میں جمع ہو کر دعا مانگنے کی تلقین کی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ چھوت کے پھیلنے کا امکان اور بھی بڑھ جاتا۔ اس قسم کے آلام کا قلع قمع جہاں تک ممکن ہے صرف سائنس کر سکتی ہے۔ سائنسی طریق کار دوگونہ خوبیوں کا حامل ہے۔ اولاً تو یہ ہمیں برائی کے اعتراف پر مائل کرتا ہے دوسرے اسے کم کرنے کے لئے دانشمندانہ طریقوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ دنیا میں اب بھی بہت سے آلام موجود ہیں جن میں سے کثرت آبادی غالباً سب سے زیادہ خطرناک ہے اس معاملے میں دنیا کی بہت سی' انتہائی تہذیب یافتہ قوموں کا رویہ بھی غیر سائنسی ہے۔

دنیا میں دوسرے لوگوں سے خوفزدہ ہونے کا رجحان جہاں تک ہمارے تجربے کا تعلق ہے بسااوقات حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ ان معنوں میں کہ ایسے لوگ یقیناً موجود ہیں کہ ان کا بس چلے تو ہمیں نقصان پہنچانے سے باز نہیں رہیں گے۔ یونہی سہی، لیکن پھر بھی۔ وہ جو ہمارے در پے آزار ہوں' انہیں اصولاً خوف کے ذریعہ تو ضرررسانی سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر آپ نے کبھی کوئی ایسا کتا پالا ہو جسے بھیڑوں کے پیچھے لپکنے کی لت پڑ گئی ہو تو یہ بات آپ کے مشاہدے میں آئی ہو گی کہ جب تک بھیڑیں حرکت نہ کریں وہ بھی پُرسکون رہتا ہے لیکن اگر بھیڑیں بھاگنے لگ پڑیں تو پھر وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا' اس مثال کو سامنے رکھئے تو ہم میں سے اکثر کا طرزعمل یا تو کتے جیسا ہو گا یا بھیڑوں جیسا۔ مجھے ایک دفعہ ایک بڑے ڈین (DANE) نسل کے کتے اور ایک تین ہفتے کے بلونگڑے کے مابین ایک نفسیاتی معرکہ آرائی دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بلونگڑا منہ میں جھاگ' بال پھلائے ہوئے' منہ سے پھس پھس کی آوازیں نکالتا ہوا اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کتے کے ذہن میں اس وقت کیا تھا۔ تاہم اس کا طرزعمل یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کے خیال میں بلونگڑے کو مافوق

الفطرت تحفظ حاصل تھا۔ کچھ دیر تو وہ اسے گھورتا رہا پھر اس نے اپنی دم ٹانگوں میں دبائی اور وہاں سے کھسک گیا۔ اگر آپ میں اتنی سی جرات بھی ہو جس کا مظاہرہ بلونگڑے نے کیا تھا تو یہ آپ کو بہت سے ممکنہ ظلم وستم سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل تو حیوانی سطح تک محدود ہے اور مجھے اس طرز عمل سے غرض ہے جو صرف انسان کے بس کی بات ہو۔ چنانچہ میں دیکھتا ہوں کہ دنیا میں تشدد اکثر و بیشتر خوف کی وجہ سے نمو پذیر ہوتا ہے۔ ہم اپنے ہمسائے کے خلاف اس خوف سے مغلظات بکتے ہیں کہ وہ کہیں ہم پر چڑھ نہ دوڑے اور بعینہ اسی خوف سے وہ ہمارے خلاف بدزبانی سے کام لیتا ہے لیکن اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہم جارحیت کو معمولی دوستانہ طرز عمل سے ختم کر سکتے ہیں۔ عدم تشدد کے نظریئے میں بس یہی ایک حقیقت کارفرما ہے۔ میں اس کی نظریاتی اساس اور مطلق حیثیت کو تو قبول کرنے سے معذور ہوں۔ تاہم یہ مانتا ہوں کہ عملی سطح پر اس کے اندر جس قدر دانش مندی کو دخل ہے اس کا ہم میں سے اکثر کو اندازہ نہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں جو شخص جارحیت سے گریز کرتا ہے وہ دراصل دوسروں کے ہاں بھی کسی حد تک اس اس رجحان کو کم کرنے کا باعث بنتا ہے اس سلسلے میں ظاہری طرز عمل کے ضابطے بھی بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں لیکن اگر عدم تشدد کا اصول انسانی کردار میں ایک گہری سطح پر اثر پذیر ہو تو اس کے ثمرات' روایتی عمل کے اثرات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوں گے۔

جب کسی خوف کے لئے ان معنوں میں ٹھوس بنیاد موجود ہو کہ جس خطرے کا اندیشہ محسوس کیا جا رہا ہے وہ بالفعل موجود ہے تو اس سے نبٹنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ فرد میں اس قسم کا حوصلہ پیدا کیا جائے کہ وہ ممکنہ آفات کو صبر و سکون سے برداشت کر لے۔ دوسرے یہ کہ سماجی نظام کو اتنا محفوظ بنا دیا جائے کہ خطرات از خود زائل ہو جائیں۔ اس کا اطلاق بالخصوص ناداری اور مفلسی کے خوف پر ہوتا ہے جو ان ملکوں میں بہت عام ہے جہاں مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی ہے' وہاں اس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس کا اثر ونفوذ بہت وسیع۔ بہت سے لوگ جو اکثر معاملات میں بہت معقول نظر آتے ہیں۔ روپے پیسے کے معاملے میں ان کا رویہ مہمل ہوتا ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بڑی بڑی رقوم کے چیک جاری کرتے وقت تو بالکل نہیں ہچکچاتے' لیکن ریزگاری کے چند معمولی سکوں سے جدا ہونا برداشت نہیں کرتے۔ اس کے مقابلے میں ''بخشش'' سے محروم ناراض بیروں کی

خشمناک نظروں کا سامنا کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ آرنلڈ بینیٹ (ARNOLD BENNETT) کا کردار کلے ہینگر (CLAY HANGER) اپنے اچھے بھلے کاروبار کے باوجود ہر وقت محتاج خانے کے تصور سے سہما ہوا رہتا ہے۔ اس قسم کے بے بنیاد خدشات سے عہدہ برآ ہونے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ ان میں سرفہرست تو رواقیوں کا معروف تسلیم و رضا کا مسلک ہے۔ کہ مصائب کا صبر وسکون سے سامنا کرنا چاہئے اور جب مصیبت ٹوٹ ہی پڑے تو اس کو اپنی جان کا روگ نہ بننے دیا جائے۔ ملٹن کا ابلیس اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو یقین دلایا جائے کہ اس کے محتاج و نادار ہو جانے کا کوئی امکان سرے سے موجو ہی نہیں۔ عام حالات میں تو یہ گر کام دے جاتا ہے۔ لیکن جہاں کیفیت زیادہ شدید ہو وہاں نفسیاتی معالج سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ حکومتی سطح پر غربت اور ناداری کا اس طرح سدباب کیا جائے کہ کوئی بدقسمت شخص بھی ان کا شکار نہ ہو سکے۔ دراصل ان تینوں طریقوں پر بیک وقت عمل کرنا چاہئے۔ جب کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو روایتی طریقہ بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ تاہم مصیبت کو صبر وسکون سے برداشت کرنے کے مقابلے میں کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ مصیبت کا سرے سے وجود ہی نہ ہو کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ خوف اسی معاشرے میں جنم لیتے ہیں جہاں حقیقی مصائب عام ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ذرائع جو صرف فرد کی حد تک مسئلے کا حل پیش کرتے ہیں اپنی تمام تر افادیت کے باوجود اس طریق کار کا نعم البدل نہیں ہو سکتے جو برائی کا معاشرتی سطح پر کلی طور پر قلع قمع کرتا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ وہ لوگ بھی موجود ہیں جو مجرد جرأت اور بہادری کے لئے اتنا جوش اور ولولہ رکھتے ہیں کہ اس کی آزمائش کے موقع ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اس کی لغویت بالکل واضح ہے۔ وہ شخص جو ایک طویل اور اذیت ناک مرض کو ہائے وائے کے بغیر چپ چاپ سہہ گزرتا ہے یقیناً قابل تعریف ہے لیکن کیا اس سے یہ بہتر نہیں تھا کہ اسے اچھی صحت نصیب ہوتی' وہ سپاہی جو میدان جنگ میں بہادری سے لڑتا ہوا جان دے دیتا ہے یقیناً تعریف کا مستحق ہے۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ موت سے بچ جاتا۔ اس ضمن میں قصوروار دراصل رواقی ہیں کہ جنہوں نے صبر و استقامت کا اس طرح ڈھنڈورا پیٹا کہ ظلم وستم اچھے نظر آنے لگے کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں ''بہترین نیکی'' کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ایک مسلک کے طور پر غرباء کے ہاں پائے جانے والے صبر و

استقامت کی بہت تعریف کی جاتی تھی لیکن یہ تب کی بات ہے جب انہیں ووٹ کا حق حاصل نہیں تھا۔

سماجی تعلقات' جہاں تک انسان کی نجی زندگی کا تعلق ہے ہمیشہ خوفزدگی کی زد میں ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں بالخصوص لوگ اپنے جذبات کے اظہار سے احتراز کرتے ہیں جہاں تک ممکن ہو وہ اپنی پسند' ناپسند کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اگر کوئی ذاتی غرض آڑے نہ آئے تو نفرت یا تحسین دونوں حالتوں میں ان کا رویہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ بے لچک' حجاب آمیز اور تکلفات سے مملو۔ اپنے اندر کے خوفزدہ بچے کو چھپائے رکھنے کے لئے وہ یہ زرہ بکتر اوڑھ لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی میل جول کوفت کا باعث بن جاتا ہے۔ دوستیوں میں گرم جوشی نہیں ہوتی اور محبت محض ایک بہلاوا۔ ان پر براؤننگ(BROWNING) کا یہ قول صادق آتا ہے۔ گویا براؤننگ نے انہی کے لئے کہا تھا۔

''خدا کا شکر لازم ہے کہ اس نے اپنی اس کم ترین مخلوق کو بھی یہ توفیق ارزانی کی ہے کہ وہ اپنی ''دو رخی'' پر ناز کر سکے۔اس کا ایک تو رخ وہ ہے جس سے وہ دوسروں کا سامنا کرتا ہے اور دوسرا وہ جسے وہ صرف اس عورت کے سامنے نمایاں کرتا ہے جس سے اسے عشق کا دعویٰ ہو۔''

میں تحلیل نفسی کا ماہر تو نہیں ہوں بہ ہم براؤننگ نے جس بات پر خدا کا شکر ادا کیا ہے اس کے متعلق کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ دنیا کے سامنے انسان صرف وہ رخ لے کر آتا ہے جس کے متعلق اسے اطمینان ہو کہ اس کے سامنے آ جانے سے انا کے مجروح ہونے کا امکان نہیں اور نہ تضحیک کی گنجائش۔ اس افشاء میں کوئی ایسا پہلو نہیں ہوتا جو ایذا رسانی کو دعوت دے۔ دوسرا روپ جسے وہ صرف محبوبہ کے سامنے ظاہر کرتا ہے' خودنمائی' زعم باطل اور کبر و ناز سے عبارت ہوتا ہے۔ یہ وہ صفات ہیں کہ جن کا برملا اظہار وہ اپنی کلب کے اراکین کے سامنے کرنے سے بھی کتراتا ہے۔ تاہم یہ دوسرا پہلو بھی' پہلے کی طرح' خوف ہی کا مظہر ہوتا ہے۔ پہلی حالت نہاں خانہ ذات میں تازہ ہوا کے جھونکوں کا راستہ روکتی ہے۔اس نہاں خانے تک رسائی کی صرف ایک صورت ہے یعنی تحسین باہمی یا چاپلوسی' یوں سمجھئے کہ باہر کی دنیا تیرہ و تاریک ہے اور اندر بے پناہ حبس۔ آپ ہی کہئے یہ بھی کوئی انسانی تعلقات کا انداز ہے۔اس طرز عمل کی ایک اور خامی یہ ہے کہ لوگ دوستانہ جذبات ہی

سے بدگماں ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں یہ خدشہ ہوتا ہے کہ ان کا اظہار۔ دوسروں کو ان کی موجودگی کا علم' ان کی کمزوری بن جائے گا۔ اکتاہٹ کی طویل گھڑیاں اور سالہا سال کا انجماد' اسی خوف کا شاخسانہ ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ جس دنیا میں خوف کی حکمرانی نہ ہوگی' وہاں نراج در آئے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح بعض ان جہات میں آزادی کی راہیں کھل جائیں گی جہاں اب جبرو کراہ کا دور دورہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی جہاں اب بے مہار آزادی ہے وہاں قانون کی عملداری ہوگی۔ مثلاً خوراک کی بہم رسانی' خام مواد کی تقسیم اور سب سے بڑھ کر انسداد جنگ کے لئے قوانین وضع کئے جائیں گے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسی دنیا کا وجود ہی ممکن نہیں جہاں آزادی تو عام ہو' لیکن بے راہ روی نہ ہو۔ البتہ دوران تعلیم ایک خاص طرح کی تربیت اس بے راہ روی کو روک سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہاں تک فطرت کی طبیعی قوتوں سے انسان کے تعلق کا معاملہ ہے وہاں لازماً سائنسی طریق کار اختیار کرنا ضروری ہوگا یعنی انسان میں حقائق کی تلاش کا ذوق اور جب حقائق تک رسائی ہو جائے تو پھر انہیں قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہوگی۔ دنیا میں اس وقت جذباتیت کا غلبہ ہے، جس کے ماتحت ناپسندیدہ حقائق کو سرے سے نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ طبیعت کے اس رجحان سے بے پناہ نقصان پہنچ سکتا ہے کہ ناپسندیدہ حقائق کے ناپسندیدہ اثرات کو ان کے نظرانداز کئے جانے کی وجہ سے اور بھی کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ذہنی تربیت یعنی حقائق کو تسلیم کرنے کی صلاحیت صرف تعلیم ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ فطرت کی طاقت کا جس حد تک وہ بالفعل موجود ہے انکار سراسر حماقت ہے۔ اس مقام پر خودسری دراصل معقولیت کے فقدان کے مترادف ہے۔

فطرت کی طبیعی طاقتوں کے حوالے سے بعض رویئے (عادات) جنہیں صرف تعلیم ہی فروغ دے سکتی ہے انسانی بقاء کے لئے بہت سودمند ہو سکتے ہیں۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ کوئی بچہ تربیت کے بغیر از خود مسواک (برش) استعمال کرنے لگے گا۔ بلکہ اس امر کا بھی امکان نہیں ہے کہ وہ صفائی کی ایسی عادات اپنا سکے جو اسے جراثیم سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ حفظان صحت کے لئے جسمانی تربیت ضروری ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ جب وہ بڑے ہو جائیں تو پند و نصیحت سے یا اپنے فائدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان عادات کو اپنا

سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تعلیم و تربیت صرف حفظان صحت ہی کے لئے ضروری نہیں بلکہ ایسے سماجی رویوں کی تشکیل کے لئے بھی ضروری ہے جو آئے دن کے لڑائی جھگڑوں کو غیر ضروری بنا دیں۔ مثلاً اگر ہم کھانے کی میز پر ایک دوسرے سے نوالہ چھیننے کی کوشش نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں ابتدائے عمر ہی سے اس کی تربیت دی گئی تھی۔ بڑا ہونے تک یہ عادت اتنی مستحکم ہو چکی ہوتی ہے کہ ہم شعوری کوشش کے بغیر اس پر کاربند رہتے ہیں۔ کھانے کے اوقات کی پابندی اگرچہ ناروا گزرتی ہے تاہم اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے کام مختصر ہو جاتا ہے۔ ان وجوہ کی بناء پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابتدائی عمر میں عادات کی تربیت اور استحکام بہت ضروری ہے۔ بعض جدید ماہرین تعلیم نے آزادی کے تصور کو اس مد میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایک مخصوص قسم کی آزادی کو تعلیم کے ذریعے برقرار رکھنا ضروری ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تعلیمی نظام اسی کا اہتمام نہیں کرتا۔ اس سے میری مراد جذباتی آزادی ہے اس کے حق میں مختلف دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ بات ہے کہ جذبات پر غیر معمولی پابندی انہیں مردہ کر دیتی ہے اور صلاحیت یا ولولے کو مفقود۔ دوسری طرف وہ جذبات جنہیں اظہار کا موقعہ نہیں دیا جاتا سیدھی راہ سے بھٹک جاتے ہیں اور اظہار کی ایسی راہیں ڈھونڈ نکالتے ہیں جو ان راہوں سے زیادہ پُرخطر ہوتی ہیں جن پر بند باندھے جاتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ایک ایسے سماج میں جہاں روایتی رسم و رواج پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہو بعض ایسے جذبات کو بھی غیر مستحسن قرار دے دیا جاتا ہے جو فی الاصل ضرر رساں نہیں ہوتے۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ سائنسی حقیقتوں اور بعض ایسی عادات کو جن کے بغیر سماجی زندگی ممکن ہی نہیں نظم و ضبط کا تابع ہونا چاہئے۔ وہاں ساتھ ہی تعلیم کے شعبے میں جذبات پر کم سے کم پابندی ہونی چاہئے اور اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ ایسے جذبوں کے اظہار کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے جو خلوص سے تہی ہوں۔

ماضی میں ''ازلی گناہ'' کے تصور کو بہت اہمیت دی جاتی تھی اور تعلیم کا مقصد کم و بیش یہ تھا کہ بچے کی نشوونما فطری تقاضوں سے بالکل مختلف انداز میں ہونی چاہئے۔ اس قسم کی تربیت کی ایک انتہا پسندانہ مثال ہمیں سینٹ آگسٹائین کے احوال میں یونانی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں نظر آتی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے لاطینی تو بغیر کسی وقت کے

آغوش مادر میں سیکھ لی اور بعد میں مجھے اس پر اچھا خاصا عبور بھی حاصل ہو گیا تھا لیکن یونانی کے سلسلے میں مجھے ایک سخت گیر استاد سے پالا پ؟ڑا۔ آئے دن کی مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے اس زبان میں مہارت حاصل نہ ہو سکی۔ تاہم دوسرے طریق کار کے وہ اس لئے مداح ہیں کہ اس کے ذریعے انہوں نے خوش باشی کے رجحان سے نجات پا لی لیکن دراصل یہی وہ نکتہ ہے جس سے بالکل متضاد نظریہ ماہرین تعلیم کو اپنانا چاہئے۔ ان کا رویہ بچے کے متعلق اس مالی جیسا ہونا چاہئے جو یہ چاہتا ہے کہ پودے زرخیز مٹی اور پانی کی مناسب مقدار کے استعمال سے پھولیں پھلیں۔ اگر گلاب کے پھول نہ کھلیں تو آپ ان کی پٹائی کرنے تو نہیں بیٹھ جاتے بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ ان کی دیکھ بھال میں آپ سے کہاں کوتاہی ہوئی ہے اگر بچے کی نشوونما رک جائے تو آپ کو اس سے وہی سلوک کرنا چاہئے جو گلاب کے پھولوں سے کیا جاتا ہے۔ بہت ہی کم استثنائی صورتوں کے علاوہ اس معاملے میں منفی کی بجائے مثبت عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں نہ یہ کہ وہ کیا نہیں کر پاتے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کو اہمیت صرف اس صورت میں حاصل ہوتی ہے کہ وہ ان کی بنیادی صلاحیت کا بے تکلف اور بے ساختہ اظہار ہو۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو بچوں کو اس نہج پر فوجی تربیت دے سکتے ہیں کہ جونہی کوئی کام کرنے کے لئے انہیں حکم ملے تو وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی انداز میں۔ وہ حکم بجا لائیں لیکن یوں ہوا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ لنگڑے لولے رہ جائیں گے اور ان کے دل کی گہرائیوں میں دنیا کے خلاف غم و غصہ بھرا ہوا ہو گا۔ کرائے کے سپاہی کے لئے یہ جذبہ سودمند ہو تو ہو لیکن ایک پُرامن دنیا کے خوش باش شہری کے لئے یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔

☆☆☆

استقراء

ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ عالم موجود کے علم کے معاملے میں ہمارے مبادیات ابہام سے پاک ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کائنات میں وہ کونسی چیزیں ہیں جن سے براہ راست آگاہی کا دعویٰ ہم کر سکتے ہیں۔ اب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے مدرکات ہی سے ہمیں براہ راست آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ انہی کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ موجود ہیں۔ یا پھر ماضی کے حسی مدرکات ہیں جو ہمارے حافظے میں محفوظ ہیں۔ جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ماضی میں موجود تھے۔ بس یہی علم ہمارے مبادیات کا کل سرمایہ ہے۔

یونہی سہی، لیکن ان مبادیات سے نتائج اخذ کرنے کے لئے (یعنی یہ جاننے کے لئے کہ مادہ موجود ہے، دوسرے لوگ بھی وجود رکھتے ہیں۔ ماضی میں وہ زمانہ بھی تھا جو ہمارے ذاتی حافظے پر تقدم رکھتا ہے یا مستقبل کی صورتحال) ہمارے پاس کچھ عام اصول وقواعد ہونے چاہئیں تاکہ ہم یہ جان سکیں کہ کسی ایک شے مثلاً ''الف'' کی موجودگی کسی دوسری چیز ''ب'' کی موجودگی پر دلالت کرتی ہے جو اس کے ساتھ بیک وقت موجود یا پہلے یا پھر بعد میں موجود تھی۔ مثلاً یہ کہ بادل کی گرج اس چیز کی علامت ہے کہ اس سے پہلے بجلی چمکی ہو گی۔ اگر یہ بات ہماری دسترس میں نہ ہوتی تو ہم کبھی علم کو اپنے ذاتی تجربے کی حدود سے ماوریٰ نہ لے جا سکتے اور ظاہر ہے کہ یہ حدود بہت ہی مختصر ہیں۔ چنانچہ جو سوال اب ہمیں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ کیا یہ توسیع ممکن بھی ہے اور ہے تو کیونکر؟

مثال کے طور پر ہم ایک ایسے معاملے سے ابتداء کرتے ہیں جس کے وجود کے متعلق

ہمیں قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں۔ ہم سب یقین رکھتے ہیں کہ سورج کل طلوع ہو گا۔ آخر کیوں؟ کیا یہ تیقن گزشتہ تجربات کا غیر شعوری (بلا سوچے سمجھے) نتیجہ ہے یا اسے معقول قرار دینے کا جواز بھی موجود ہے (یا اس کی معقولیت کا جواز بھی ہے) کوئی ایسا معیار تلاش کر لینا سہل نہیں ہے جس کی رو سے ہم اس قسم کے کسی یقین کے متعلق کہہ سکیں کہ وہ معقول ہے یا نہیں۔ تاہم کچھ ایسے عام تعینات وضع کئے جا سکتے ہیں جو اگر اپنی جگہ پر صحیح ہوں تو ان کے حوالے سے یہ اندازہ جائز ہو گا کہ سورج کل بھی طلوع ہو گا اور اسی طرح کے دوسرے اعتقادات جن پر ہمارے اعمال کا مدار ہوتا ہے۔

یہ تو سامنے کی بات ہے کہ اگر ہم سے پوچھا جائے کہ ہم یہ کیونکر مان لیتے ہیں کہ سورج کل بھی طلوع ہو گا تو ہمارا جواب یہ ہو گا ''اس لئے کہ سورج ہر روز طلوع ہوتا رہا ہے۔'' ہمیں پختہ یقین ہے کہ مستقبل میں بھی یونہی ہو گا۔ کیونکہ ماضی میں یونہی ہوتا رہا ہے اگر ہم سے مزید تعرض (استفسار) کیا جائے کہ آخر ہم اس بات پر کیوں یقین رکھتے ہیں کہ سورج آئندہ بھی اس طرح طلوع ہوتا رہے گا جیسے کہ وہ اب تک ہوتا رہا ہے۔ تو جواباً ہم قانون حرکت کا سہارا لے سکتے ہیں۔ ہمارا جواب ہو گا کہ زمین اپنے محور پر گھومنے والا کرہ ہے اور اس طرح کے اجسام (اجرام) اس وقت تک گھومتے چلے جاتے ہیں جب تک خارج سے کوئی شے ان کی گردش میں خلل انداز نہ ہو اور جہاں تک زمین کا تعلق ہے ایسا کوئی عنصر آج اور کل کے درمیان حائل ہونے والا موجود نہیں ہے۔ البتہ اس شک کی گنجائش پھر بھی باقی رہے گی کہ کسی خارجی مزاحم کی عدم موجودگی پر ہمارا یقین واثق ہے یا نہیں۔ تاہم یہ شبہ اتنا اہم بھی نہیں جو بات واقعی اہم ہے وہ یہ ہے کہ قانون حرکت کل تک واقعی مؤثر رہے گا۔ اگر یہ نکتہ اٹھایا جائے تو پھر صورتحال ایسی ہو جائے گی جیسی سورج کے طلوع ہونے کے متعلق پہلی دفعہ شک کے موقعہ پر پیدا ہوئی تھی۔

قوانین حرکت کے مؤثر ہونے کے متعلق ہمارے یقین کی صرف ایک وجہ ہے کہ جہاں تک ماضی کے متعلق ہمارا علم کام کرتا ہے یہ قوانین آج تک مؤثر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ قوانین حرکت کے بارے میں ماضی سے ہمیں جتنے ثبوت حاصل ہوتے ہیں وہ طلوع آفتاب کے متعلق شواہد سے کہیں زیادہ ہیں کیونکہ طلوع وغروب تو قوانین حرکت کے نفاذ کی صرف ایک مثال ہے اور اس طرح کی بے شمار اور مثالیں بھی موجود ہیں لیکن اصل سوال یہ

ہے کہ ماضی میں کسی قانون کے مؤثر ہونے کے متعلق متعدد شواہد کی موجودگی کیا یہ ثابت کرنے کے لئے کفایت کرتی ہیں کہ وہ قانون آئندہ بھی مؤثر رہے گا؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے پاس آئندہ طلوع آفتاب کی امید رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ یہ امید رکھنے کی کوئی وجہ ہے کہ جو کھانا ہم کل کھائیں گے وہ ہمارے لئے زہریلے اثرات کا حامل نہیں ہوگا اور نہ ہی اس قسم کی لاتعداد نیم شعوری امیدوں کے لئے جو ہماری روزمرہ کی زندگی کے معمولات پر اثر انداز ہوتی ہیں کوئی وجہ جواز باقی رہتی ہے۔ لہٰذا ثابت یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی امجدیں صرف امکانات کی آئینہ دار ہیں۔ صرف امکانات کا درجہ رکھتی ہیں چنانچہ ہمیں کسی ایسے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ ضرور پوری ہو کر رہیں گی۔ صرف یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ کسی نہ کسی باعث ان کے پورا ہونے کا امکان موجود ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں ابتداء ہی میں ایک بات واضح کر دینی چاہئے کیونکہ اس وضاحت کے بغیر ہم جلد ہی مایوس کن الجھن کا شکار ہو جائیں گے کہ تجربے نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ ایک خاص ترتیب یا ایک ہی وقت میں باہم وجود پذیری کا تواتر اس توقع کا سبب بنتا ہے کہ وہ ترتیب یا باہم وجود پذیری آئندہ بھی برقرار رہے گی۔ ایک خاص رنگ روپ کی خوراک بالعموم ایک خاص ذائقہ کی حامل ہوتی ہے۔ لیکن اگر بظاہر اسی رنگ روپ کی حامل خوراک کا ذائقہ مختلف ہو جائے تو ہماری توقع کو سخت دھچکا لگتا ہے۔ جن چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں عادتاً ان کے ساتھ کچھ لمس کی کیفیات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ جب ہم ان چیزوں کو چھوتے ہیں تو یہ توقع رکھتے ہیں کہ اسی لمس کی کیفیات دہرائی جائیں گی۔ بھوت پریت کی اکثر کہانیوں میں خوف کی فضایوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ بھوت پریت کا وجود حس لامسہ کو متاثر نہیں کرتا۔

اسی قسم کا تجربہ ان جاہل لوگوں کو بھی ہوتا ہے جو پہلی دفعہ دوسرے ملکوں میں جا کر یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ وہاں ان کی مقامی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

بیا ورید گر ایں جا بود سخن دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

تلازمات کا یہ عمل انسان تک ہی محدود نہیں، حیوانات میں بھی اس کی شد و مد دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ گھوڑا جو ایک خاص عرصے تک ایک ہی راستے پر آتا جاتا رہا ہو اسے دوسرے

راستے پر ہانکنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ پالتو جانور جب اس آدمی کو دیکھتے ہیں جو انہیں ہر روز دانہ پانی ڈالتا ہے تو ان کے ہاں چارے کی توقع بیدار ہو جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تسلسل یا تواتر کی یہ خام مثالیں کسی حد تک گمراہ کن بھی ہوتی ہیں۔ وہ شخص جو چوزوں کو دانہ پانی ڈالتا ہے ایک دن انہیں ذبح کر ڈالتا ہے۔

لٰہذا فطرت میں ہم آہنگی کے متعلق زیادہ دقیقہ رس تصور کی ضرورت ہے ورنہ چوزے کا انجام ہمارا بھی مقدر ہو گا۔

یہ توقعات لاکھ گمراہ کن ہوں تاہم ان کی موجودگی کو نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ صرف یہ بات کہ ایک امر متعدد بار وقوع پذیر ہو چکا ہے انسانوں اور حیوانوں میں یہ توقع پیدا کرتا ہے کہ وہ آئندہ بھی واقع ہو گا۔ چنانچہ جبلی طور پر ہم یہ باور کر لینے پر آمادہ رہتے ہیں کہ سورج کل بھی طلوع ہو گا تاہم اس چوزے کی نسبت کسی طور بھی بہتر حالت میں نہیں ہوتے جو غیر متوقع طور پر اپنی گردن کٹوا بیٹھتا ہے۔ چنانچہ ہمیں دو امور میں فرق ملحوظ رکھنا پڑے گا ایک تو یہ کہ ماضی کی ہم آہنگی مستقبل کے لئے توقعات کو جنم دیتی ہے دوسری بات یہ کہ جب ان توقعات کے جواز کا سوال درپیش ہو تو پھر ان کے جواز کے بارے میں ہمارے پاس معقول دلیل ہے یا نہیں۔

چنانچہ سردست جو سوال ہمارے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس فطرت کی ہم آہنگی یا تسلسل پر یقین رکھنے کے لئے معقول وجہ ہے۔ فطرت کی ہم آہنگی یا تسلسل میں یقین کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ واقع ہو چکا ہے یا واقع ہو گا وہ کسی ایسے قانون عامہ کی زد میں آتا ہے جس میں استثناء کی گنجائش نہیں۔ جو سادہ توقعات اب تک ہمارے پیش نظر تھیں ان میں استثناء کی گنجائش ہے۔ اس لئے جو ان پر تکیہ کریں گے انہیں مایوس ہونا پڑے گا لیکن سائنس میں عام طور پر عملاً یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ عام قوانین جہاں مستثنیات موجود ہوتی ہیں بالآخر ایسے عام قوانین کو جگہ دے دیتے ہیں جن میں مستثنیات در نہیں آتیں۔ ''ہوا میں بے سہارا اجسام گر جاتے ہیں'' یہ ایک عام اصول ہے جس کے خلاف غبارے اور ہوائی جہاز استثناء کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن اصول حرکت اور اصول کشش ثقل جو بہت سے گرنے والے اجسام کی توجیہہ پیش کرتے ہیں وہ ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ غبارے اور ہوائی جہاز اوپر اٹھ سکتے ہیں اس طرح قانون حرکت اور قانون کشش ثقل ان

مستثنیات کی زد میں نہیں آتے۔

یہ توقع کہ سورج کل بھی طلوع ہو گا اس صورت میں غلط ہو جائے گی اگر زمین اچانک کسی ایسے بڑے وجود سے ٹکرا جائے جو اس کی محوری گردش کو معطل کر دے۔ لیکن قانون حرکت اور قانون کشش ثقل اس واقعہ سے بھی متاثر نہیں ہوں گے۔ سائنس کا کام یہ ہے کہ قانون حرکت اور کشش ثقل جیسے ایسے کلیئے دریافت کرے جو ہمارے تجربے کی حد تک استثناء سے مبرا ہوں۔ اس تلاش و جستجو میں سائنس کو اہم کامیابی حاصل ہوئی ہے یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ ہم آہنگ قوانین اب تک صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ اس طرح ہم واپس اسی سوال پر آ جاتے ہیں کہ اس مفروضے کے پیش نظر کہ ماضی میں یہ قوانین نافذ العمل رہے ہیں کیا ہمارے پاس یہ فرض کر لینے کی کوئی وجوہات ہیں کہ یہ آئندہ بھی لاگو ہوں گے۔

اس ضمن میں ایک دلیل یہ دی گئی ہے کہ ہم بوجوہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل بھی ماضی کے مشابہ ہو گا۔ کیونکہ وہ جو کبھی مستقبل تھا مسلسل ماضی میں ڈھلتا رہا ہے اور اپنے سے پہلے کے ماضی سے مشابہت کا حامل بھی رہا ہے۔ چنانچہ مستقبل بالفعل ہمارے تجربے میں رہا ہے ان معنوں میں کہ جسے ہم اب ماضی کہتے ہیں (اور جو ہمارے تجربے میں شامل ہے) وہ پہلے مستقبل ہی تو تھا۔ اسے ہم گزرا ہوا مستقبل یا مستقبل ماضی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ حجت بازی دراصل دعویٰ کو دلیل مان لینے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ درست ہے کہ ہمیں مستقبل ماضی کا تجربہ حاصل ہے لیکن مستقبل کے مستقبل کا تجربہ حاصل نہیں ہے۔ اب سوال یوں بنتا ہے کہ کیا مستقبل کا مستقبل بھی مستقبل ماضی کے مماثل یا مشابہ ہو گا؟ اس کا جواب کسی ایسی دلیل سے ممکن نہیں جو صرف مستقبل ماضی سے آغاز کرتی ہو۔ لہٰذا ہمیں اب بھی کسی ایسے اصول کی تلاش ہے جو یہ ثابت کر سکے کہ مستقبل بھی انہی قوانین کا پابند ہو گا جن کا ماضی میں چلن رہا ہے۔

اس سوال میں مستقبل کا حوالہ سرے سے بے محل ہے کیونکہ یہ سوال تو اس وقت بھی درآتا ہے جب ہم ان قوانین کے اطلاق پر غور کرتے ہیں جو ہمارے تجربے کے مطابق ماضی کے ان حقائق پر لاگو ہوتے ہیں جن کا ہمیں خود کوئی تجربہ نہیں۔ مثال کے طور پر علم طبقات الارض یا نظام شمسی کا آغاز۔ دراصل جو سوال ہمیں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی سی دو چیزیں اکثر باہم ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی ہوں اور ایسی کوئی مثال موجود نہ ہو

کہ ان میں سے ایک دوسری کے بغیر وقوع پذیر ہوئی ہو تو کیا ایک نئے ماحول میں ان میں سے ایک کا وقوع پذیر ہونا ہمیں کوئی ایسی قابل وثوق ضمانت فراہم کرتا ہے جس کی بناء پر ہم دوسری کے وقوع پذیر ہونے کی توقع قائم کر سکیں؟ مستقبل کے متعلق ہماری تمام تر توقعات استقرائی طریقے سے حاصل ہونے والے نتائج بلکہ ان تمام معتقدات (جن پر ہماری روزمرہ زندگی کی بنیاد ہے) کے جواز کا دارومدار اس سوال کے جواب پر منحصر ہے۔

یہ بات آغاز ہی میں قبول کر لینی چاہئے کہ اگر دو چیزیں اکثر و بیشتر اکٹھی پائی جائیں اور کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے الگ ظہور پذیر نہ ہوتی ہوں تو اپنی جگہ یہ امر حتمی طور پر یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ آئندہ پیش آنے والی صورتحال میں بھی باہم یکجا پائی جائیں گی۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ تواتر کی کثرت آئندہ کے لئے بھی ان کی یکجائی کی توقع پیدا کرتی ہے۔ جس قدر تواتر زیادہ ہوگا اتنی یہ توقع وثوق سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی تاہم مطلق وثوق کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مسلسل تکرار کے باوصف بالآخر کسی موقع پر اس میں نقص واقع ہو سکتا ہے جیسے کہ اس چوزے کے باب میں ہوا تھا جس کو آخر میں ذبح کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہم صرف امکان ہی کی توقع رکھ سکتے ہیں۔

یہ حجت جو ہم نے ابھی قائم کی ہے اس کے خلاف یہ نکتہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام مظاہر فطرت کسی نہ کسی قانون کے پابند ہوتے ہیں اور بعض اوقات اپنے مشاہدے کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف ایک قانون ہی کسی مسئلے کے تمام تر پہلوؤں پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں دو باتیں کہی جا سکتی ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ بالفرض اگر ہم بظاہر کوئی ایسا قانون یا اصول ''دریافت بھی کر لیتے ہیں جو استثنٰی سے مبرا ہو پھر بھی عملی طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے استثنٰی سے مبرا قانون دریافت کیا ہے یا صرف ایک ایسا قانون جس میں بالفعل استثنٰی کی گنجائش موجود نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قانون کی حکمرانی بھی صرف ایک توقع ہے اور ہمارا یہ تیقن کہ مستقبل میں بھی اسی کا چلن ہوگا یا ماضی کے ان امور پر بھی یہ صادق آتا ہے جو ہماری دسترس سے باہر رہے ہیں خود اسی اصول پر مبنی ہے جس کا ہم جائزہ لے رہے ہیں۔

زیر نظر اصول کو اصول استقراء کہہ لیجئے اور اس کے دو اجزاء کو اس طرح بیان کیا جا سکتا

ہے۔

ا۔ جب ایک شے ازقسم ''الف'' ایک دوسری چیز ازقسم ''ب'' کے ساتھ لزوم کا درجہ رکھتی ہو اور یہ کہ ''الف'' اور ''ب'' کے اس لزوم کے جتنے زیادہ شواہد اکٹھے کئے جا سکیں کہ الف کا لزوم کسی حال میں بھی اس دوسری قسم ''ب'' سے منقطع نہ ہوا ہو۔ تو اتنا ہی اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ ایک نئی صورتحال میں بھی یہ لزوم موجود ہوگا جبکہ ان میں سے ایک کی موجودگی ہمارے علم میں ہو۔

۲۔ ایک ہی جیسی صورت حال میں لزوم کی کثرت ایک تازہ صورتحال میں اس لزوم کے امکان کو کم و بیش یقینی بنا دے گی اور یہ تیقن گویا لامحدود ہوگا۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے یہ اصول صرف ایک تازہ صورتحال میں ہماری توقع کی تصدیق کے لئے کارآمد ہوسکتا ہے لیکن ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں آیا ایک عام اصول کے طور پر بھی اس قسم کا امکان موجود ہے کہ ''الف'' قسم کی اشیاء ''ب'' قسم کی اشیاء کے ساتھ ہمیشہ التزاماً موجود ہوتی ہیں بشرطیکہ الف اور ب کے لزوم کی متعدد مثالیں ہمارے علم میں ہوں لیکن عدم لزوم کی کوئی مثال موجود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ عام اصول کی حد تک امکان' انفرادی حالتوں کے مقابلے میں کمتر ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر عام اصول صحیح ہو تو پھر انفرادی صورتوں میں بھی وہ لازماً صحیح ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس انفرادی مثال میں اصول کی صحت اصول کی عمومی صحت کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ تاہم انفرادی صورتوں کی طرح عام اصول کے دونوں حصوں کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔

(الف) جتنی زیادہ تعداد میں ایک شے ازقسم ''الف'' ایک دوسری شے ازقسم ''ب'' سے حالت لزوم میں پائی جائے اسی حد تک یہ امکان بڑھ جاتا ہے (بشرطیکہ لزوم کی عدم موجودگی کی مثالیں موجود نہ ہوں) کہ ''الف'' ہمیشہ ''ب'' سے لازم و ملزوم ہوتا ہے۔

(ب) ایک جیسے حالات میں ''الف'' اور ''ب'' کے لزوم کی متعدد مثالیں اس امر کو کم و بیش یقین کی حد تک پہنچا دیتی ہیں کہ ''الف'' ہمیشہ ''ب'' سے ملزوم ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے عام اصول بھی کسی تحدید کے بغیر تیقن کے درجے سے قریب تر ہو جاتا ہے۔

یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہئے کہ امکان ہمیشہ ایک مخصوص مواد سے مشروط ہوتا ہے۔ زیر بحث مثال میں مواد ''الف'' اور ''ب'' کے باہمی ربط کا دارومدار صرف معلوم مواقع تک

محدود ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مواد بھی ہوسکتا ہے۔ جسے پیش نظر رکھا جائے تو اس امکان کو بری طرح متاثر کرسکتا ہے۔ مثلاً ہمارے پیش کردہ اصول کے حوالے سے ایک شخص جس نے بے شمار سفید بطخیں دیکھی ہوں وہ یہ حجت قائم کرسکتا ہے کہ ''جو مواد اس کی دسترس میں ہے اس کے پیش نظر یہ امکان موجود ہے کہ تمام بطخیں سفید ہوتی ہیں۔'' یہ دلیل بالکل صحیح ہو گی۔ اگر کچھ بطخیں سیاہ رنگ کی ہوں تو بھی اس سے دلیل باطل نہیں ہو جاتی کیونکہ اس امر کہ باوصف کہ کچھ مواد ایک خاص شے کے امکان کو رد کرتا ہے وہ شے بالفعل وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ مثلاً اسی بطخوں والے قصے میں ایک آدمی کا یہ علم کہ رنگ مختلف حیوانات میں پائی جانے والی ایک تغیّر پذیر صفت ہے اس لئے رنگ کی بنیاد پر کوئی استقرائی حجت (دلیل) قائم کرنے میں غلطی کا قرینہ موجود ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک نئے (تازہ) مواد کی حیثیت رکھتا ہے جو کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں کرتا کہ پہلے سے موجود مواد کی بناء پر جس امکان کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ وہ غلط تھا۔ چنانچہ یہ امر کہ اکثر اوقات ہماری توقعات پوری نہیں ہوتیں یہ ثبوت مہیا نہیں کرتا کہ آئندہ بھی ایک خاص موقعہ پر انفرادی یا مجموعی صورتحال میں وہ پوری نہیں ہوں گی۔ اس طرح اپنے استقرائی اصول کو محض تجربے کی بناء پر رد کرنے کا جواز موجود نہیں ہے۔

دوسری طرف استقراء کا اصول تجربے کی مدد سے پایہ ثبوت کو بھی نہیں پہنچتا۔ ان امور کی حد تک جن کا جائزہ لیا جا چکا ہو، تجربہ اصول استقراء کی تائید کرسکتا ہے' لیکن جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جو ابھی تک جائزے کی حد میں شامل نہیں تھے صرف اصول استقراء ہی ہے جو امور معلومہ سے حاصل کردہ نتائج کو امور نامعلوم پر اطلاق کا جواز مہیا کرتا ہے وہ تمام دلائل جو تجربے کی بناء پر مستقبل یا ماضی و حال ے نامعلوم امور پر حکم لگاتے ہیں استقراء کے اصول ہی کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس لئے تجربے کی بناء پر اس اصول کی تصدیق کا دعویٰ بے دلیل ٹھہرے گا۔ چنانچہ اصول استقراء کو یا تو اس کے داخلی ثبوت کی بناء پر قبول کرنا پڑے گا یا مستقبل کے متعلق تمام امکانی توقعات کے جواز سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اگر یہ اصول ناقص ہے تو پھر ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ توقع رکھیں کہ سورج کل بھی طلوع ہوگا۔ نہ اس بات کا کوئی جواز ہوگا کہ روٹی کو پتھر کے مقابلہ میں زیادہ غذائیت کا حامل سمجھیں یا یہ کہ منڈیر سے تجاوز چھت سے گرنے کا باعث بن جائے گا۔ اگر ہم ایک

ایسے جسم کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھیں جو بظاہر ہمارا بہترین دوست نظر آتا ہے تو ہمارے پاس یہ فرض کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے سینے میں ہمارے بدترین دشمن یا کسی اجنبی کا دل نہیں دھڑک رہا۔ ہمارا عمل سراسر ان تلازمات پر منحصر ہوتا ہے جو ماضی میں کارآمد ثابت ہوئے تھے اور ہم انہی کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ آئندہ بھی کارآمد ہوں گے یہ امکان اپنے جواز کے لئے اسی اصول استقراء کا محتاج۔

سائنس کے عام اصول یا نظریات مثلاً قانون کی عملداری اور یہ اعتقاد کہ ہر واقعہ کا لازماً کوئی سبب ہوتا ہے۔ اسی اصول استقراء کے تابع ہیں جس طرح ہماری روزمرہ زندگی کے تعینات۔ ان سب عام اصولوں کو محض اس لئے تسلیم کیا جاتا ہے کہ نوع انسان بے شمار مواقع پر ان کی صحت کی تصدیق کر چکی ہے اور ان کے ابطال کی کوئی مثال موجود نہیں۔ تاہم صرف اتنی سی بات مستقبل میں ان کی صحت کی ضمانت نہیں دے سکتی تاوقتیکہ اصول استقراء تسلیم نہ کر لیا جائے۔

چنانچہ وہ تمام تر علم جو تجربے کی بناء پر اس امر کے متعلق کچھ انکشاف کرتا ہے جو ہمارے تجربے میں نہیں آیا اس کی بنیاد صرف اس تیقن پر ہے کہ تجربہ نہ تو اس کی توثیق کر سکتا ہے نہ تردید۔ تاہم اپنے معروضی اطلاق کی حد تک اس کی جڑیں ہمارے شعور میں اسی طرح پیوست ہیں جس طرح ہمارے تجربے میں آنے والے بہت سے امور۔ اس قسم کے تعینات کا وجود اور جواز فلسفے کے بہت سے مشکل ترین اور متنازعہ مسائل کو جنم دیتا ہے۔

مشاہدہ نہ کئے جانے والے نتائج اور استقراء

استقراء کے متعلق میری رائے میں 1944ء میں بہت اہم تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ بالخصوص اس شعور کی وجہ سے کہ اگر استقراء کو عقل سلیم کی مدد کے بغیر استعمال کیا جائے تو وہ اکثر و بیشتر صحیح نتائج کی بجائے غلط نتائج تک لے جاتا ہے۔

1944ء کے بعد سے میرے نظریات مختصراً یوں بیان کئے جا سکتے ہیں۔

ناقابل مشاہدہ نتائج سائنس اور عقل سلیم میں ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر ان واقعات کے متعلق کچھ نہیں جانتے جو ہمیں دو سال کی عمر سے پہلے پیش آئے ہوں۔ تاہم کوئی بھی اس امر سے انکار نہیں کرتا کہ وہ اس عمر سے

پہلے موجود تھا۔ اگر آپ کسی سہ پہر گرم خرام ہوں اور سورج آپ کے پیچھے ہو تو سایہ آپ کے آگے چلتا ہے اور آپ ایک لمحہ کے لئے بھی اس شک میں مبتلا نہیں ہوتے کہ اس سائے کا آپ کے جسم سے کوئی علّی واسطہ نہیں ہے۔ اسی طرح بالعموم یہ بھی فرض کر لیا جاتا ہے کہ مشاہدے میں نہ آسکنے والے نتائج کا انحصار استقراء پر ہوتا ہے۔ تاہم معدودے چند معاملات کے علاوہ یہ بات بالعموم درست نہیں مانی جا سکتی۔ سائنس دان جس استقراء کو قبول کرتے ہیں اس کا تعلق اس نوع سے ہے جسے سائنسی شعور قبول کرتا ہے۔ اگر اس عقل سلیم کو نظر انداز کر دیا جائے تو استقراء زیادہ تر غلط نتائج کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ خام نوعیت کے استقراء کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اگر ''الف'' کی قسم کے تمام معلوم مظاہر ''ب'' کی قسم کے مظاہر بھی ہوں اور اگر یہ مظاہر بکثرت موجود ہوں تو یہ کہنا قرین قیاس ہو گا کہ تمام ''الف''، ''ب'' ہیں ایک عام بیان کے اعتبار سے یہ بات صریحاً غلط ہو گی۔ فرض کیجئے ''الف'' اور ''ب'' دو ایسے مجموعے یا جماعتیں ہیں جن میں بہت سے افراد یا اجزاء مشترک ہیں۔ پھر بھی ''ب'' کی ایسی بے شمار جماعتیں ہو سکتی ہیں جن میں ''الف'' گروہ کے تمام افراد یا اجزاء۔ اشتراک کے حامل نہ ہوں گے۔ چنانچہ استقراء ایک عام اصول کی حیثیت سے مشاہدے کی سطح پر غلط ثابت ہوتا ہے اور اگر اسے استعمال کرنا ناگزیر ہو تو پھر مطلوبہ حدود کی پابندی بھی لازمی ہو گی۔ مثال کے طور پر اس توضیح پر غور کیجئے۔

فرض کیجئے ایک ایسا لڑکا ہے جس کا قد آپ ہر مہینے کی یکم تاریخ کو ماپتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک خاص عرصے تک اس کا قد ایک متعین رفتار سے بڑھتا رہا ہے۔ اگر آپ کو انسانی قد کی افزائش کے متعلق کوئی علم نہ ہو تو از روئے استقراء آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس کا قد اسی رفتار سے بڑھتا رہے گا تا آنکہ اس کا سر ستاروں کو چھونے لگے گا۔ دراصل اس قسم کے فارمولوں کی کوئی انتہا ہی نہیں جو لڑکے کے قد کی افزائش جیسے محدود مسائل پر لاگو ہوتے ہیں۔ خاص استقراء کو مان لیا جائے تو اس کے حوالے سے اس قسم کے تمام فارمولے باہمی متضاد ہونے کے باوصف درست قرار پائیں گے کینیز (KEYNES) نے اپنی تصنیف ''محاکمہ امکان'' (TREATISE ON PROBABILITY) میں یہ وضاحت کی ہے کہ بعض حالات میں استقراء اس کی تصدیق کرنے والی مثالوں کے علم سے پہلے بھی جائز ہوتا ہے۔ بشرطیکہ حاصل شدہ تقسیم محدود اطلاقی نوعیت کی حامل ہو۔ اس نکتہ نظر کو قبول کرتے ہوئے میں

اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ استقراء کے جائز استعمال کی کوئی نامشہود خصوصیت نہیں ہے بلکہ یہ کہ دوسرے نامشہود مزعومات کا ہونا ضروری ہے جن کے بغیر زیر نظر مطلوبہ محدود امکان استقراء کو تفویض نہیں کیا جا سکتا۔ حاصل مطلب یہ کہ سائنسی استقراء کے لئے اس کے علاوہ کچھ اور ماورائے منطق قواعد کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اس قسم کے مزعومات سے میں نے علیحدہ بحث کی ہے۔

علم اور کرداریت

کرداریت کے مسلک میں علم کا لفظ بھی حافظے کی طرح استعمال نہیں کیا جاتا تاہم ایک ایسا مظہر بالفعل موجود ہے۔ جسے بالعموم ''علم'' کہا جاتا ہے اور جسے کرداریت کے اصولوں کے مطابق پرکھا جاتا ہے۔ ہم اسی مظہر کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ اس میں کوئی ایسی بات ہے جس سے کرداریت بخوبی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ علم ''مہیج'' یا ''محرک'' اور ''ردعمل'' کے پورے سلسلے کو محیط ایک خصوصیت ہے بلکہ بصارت اور سماعت کے ضمن میں تو یہ سلسلہ ایک بیرونی عامل (وجود) سے ردعمل تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بیرونی وجود مہیج سے خارجی ماحول میں مادی علتوں کی ایک زنجیر میں منسلک ہوتا ہے۔ سردست بصارت اور سماعت سے صرف نظر کرتے ہوئے قطعیت کی خاطر ہم اس ''علم'' پر توجہ مرکوز کریں گے جس کا تعلق لمس سے ہے۔

لمس سے پیدا ہونے والے ردعمل کا مشاہدہ چھوٹے سے چھوٹے حیوانات' کیڑوں مکوڑوں اور سمندری مونگوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جس کو چھوتے ہیں انہیں اس کا ''علم'' ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے اس کا جواب ''ہاں'' میں ہوگا۔ علم مدارج کے تعین پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ کرداریت کی رو سے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ جہاں مہیج کے لئے ایک خاص ردعمل کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں جہاں ایک خاص ردعمل ایک مخصوص مہیج کے بغیر ظاہر نہ ہوتا ہو وہاں علم بھی کسی حد تک موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ''علم'' اور احساس (حاسہ) میں ادراک کے حوالے سے تمیز باقی نہیں رہتی۔ ہم انہی معنوں میں نچلی سطح کے حیوانات سے علم منسوب کر سکتے ہیں۔ یہ ایک اسی طرح کی بات

ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ تھرمامیٹر کو درجہ حرارت کا علم ہوتا ہے اور کمپاس کو قطب شمالی کی سمت کا۔ مثال کے طور پر کئی حیوانات جب روشنی کے سامنے آئیں تو اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں' لیکن عام حالتوں میں وہ چھپنے کے ردعمل کا اظہار نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے وہ ریڈیومیٹر سے مختلف نہیں ہوتے۔ اگرچہ طریق کار میں اختلافات موجود ہوتا ہے تاہم مشاہدہ میں آنے والی بنیادی حرکات وسکنات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ چنانچہ جہاں اضطراری عمل موجود ہو وہاں ایک لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ متعلقہ حیوان کو مہیج کا ''علم'' ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ علم کا مروجہ مفہوم تو نہیں ہے۔ البتہ یہی وہ جرثومہ ہے جس سے علم اپنے مروجہ معنوں میں وجود پذیر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر علم کا وجود ممکن ہی نہیں۔

اپنی ترقی یافتہ صورتوں میں علم صرف سیکھنے سے (کسب) سے حاصل ہو سکتا ہے وہ چوہا جو بھول بھلیاں سے واقفیت حاصل کر چکا ہے اسے ان سے باہر نکلنے کے راستہ کا ''علم'' ہو جاتا ہے۔ وہ لڑکا جس نے بعض لفظی ''ردعمل'' سیکھ لئے ہوتے ہیں۔ اسے ریاضی کے پہاڑوں کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ معمول کچھ جانتا ہے کیونکہ وہ ایک خاص طرح کے ''مفید مطلب'' ردعمل کا اظہار کرتا ہے اور اس ردعمل کا اظہار مخصوص پیشگی تجربوں کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں مفید مطلب جیسے مفہوم کو علم کے معاملے میں درمیان میں نہیں لانا چاہئے۔ چوہے اور بھول بھلیاں کے معاملے ہی کو لیجئے۔ یہاں جو چیز ہمارے مشاہدے میں آتی ہے وہ صرف خوراک تک پہنچنے کے لئے بے تاب حرکات وسکنات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ جب چوہا خوراک تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اسے کھانے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ حرکات بھی ترک ہوتی چلی جاتی ہیں جو خوراک تک رسائی میں ممد نہ ہوں۔ اس طرح کے عملی رویئے کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مقصود صرف خوراک تھا اور جب وہ اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے مختصر ترین راستہ اختیار کرتا ہے تو گویا اسے خوراک تک پہنچنے کے راستے کا ''علم'' حاصل ہوتا ہے۔

اگر یہ رائے صحیح ہے تو پھر ان حالات کے حوالے کے بغیر جو حیوان کے عمل کے رخ کو متعین کرتے ہیں ہم کسی علم کی کوئی تعریف پیش نہیں کر سکتے بلکہ اصل میں یوں کہنا چاہئے کہ حیوان خاص قسم کے حالات کی خواہش کرتا ہے۔ خواہش' تمنا' یا طلب کی بھی ''علم'' کی

طرح کرداریت کے نقطہ نظر سے تعریف ممکن ہے۔ بلکہ یہ دونوں لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ دریں صورت مناسب ہوگا کہ پہلے کرداریت کے حوالے سے ''خواہش'' کو جو حیثیت حاصل ہے اس کا جائزہ لیا جائے۔

خواہش کی سب سے اچھی مثال ''بھوک'' ہے۔ بھوک کی تحریک ایک جانی پہچانی جسمانی کیفیت ہے۔ اس حالت میں حیوان سے بے تاب حرکات سرزد ہوتی ہیں جب وہ خوراک کو دیکھ لیتا ہے یا اس کی خوشبو پا لیتا ہے تو پھر وہ اس طرح کا عمل کرتا ہے جو معمول کے حالات میں اسے خوراک تک پہنچا سکتا ہے اور پھر جب وہ اسے حاصل کر لیتا ہے تو کھانے لگ جاتا ہے۔ اگر خوراک کی مقدار کافی ہو تو مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس پورے عمل کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ بھوکا جانور خوراک کی خواہش رکھتا ہے صرف یہ عملی طریق کار ہی کئی طریقوں سے حیوان کو بے جان مادے سے متمیّز کرتا ہے۔ کیونکہ بے چینی اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک ایک خاص شرط پوری نہیں ہو جاتی۔ یہ حرکات و سکنات مطلوبہ شرط کو پورا کرنے کے لئے بہترین ثابت ہوں یا نہ ہوں ایک الگ بات ہے۔ اس ضمن میں اس بڑی مچھلی کی مثال سامنے رکھیئے جسے تجربے کے دوران شیشے کی دیوار کے ایک طرف رکھا گیا تھا جب کہ خوراک چھوٹی مچھلیاں اس دیوار کے دوسری طرف تھیں۔ وہ بار بار اپنی ناک شیشے کی دیوار سے ٹکراتی رہیں اور مسلسل ناکامی کی وجہ سے چند ہفتوں کے بعد اپنی کوشش ترک کر دی۔ اب شیشے کی دیوار درمیان سے ہٹا دی گئی لیکن بڑی مچھلی نے چھوٹی مچھلیوں کا پیچھا کرنے سے احتراز کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس تجربے میں مچھلیوں تک پہنچنے کے لئے کسی پُر پیچ راستے کی گنجائش رکھی گئی تھی یا نہیں۔ پُر پیچ راستہ اختیار کرنے کے لئے جس ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ شاید مچھلیوں کی صلاحیت سے بعید تر ہے۔ البتہ کتوں اور بندروں کو اس میں زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔

جن معمولات کا تعلق بھوک سے ہے ان کا اطلاق دوسری خواہشات پر بھی ہوتا ہے ہر حیوان کو خلقی طور پر خواہش کا حاسہ میسر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض جسمانی کیفیات اسے بے چین حرکات پر مجبور کر دیتی ہیں جو کسی اضطراری عمل کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اگر ایک ہی طرح کی مصنوعی صورتحال دہرائی جائے تو حیوان جلد تر مطلوبہ اضطراری عمل کا مظاہرہ کرنے پر قادر ہو جاتا ہے لیکن یہ خصوصیت صرف اونچے درجے کے حیوانات

ہی میں پائی جاتی ہے۔ چھوٹے درجے کے حیوانات میں از ابتداء تا انتہا تمام عمل اضطراری ہوتا ہے اور اس لئے صرف معمول کے حالات ہی میں کامیاب ہوتا ہے۔ اونچے درجے کے حیوانات بالخصوص انسانوں کے طرز عمل میں کسب (یا سیکھنے) کا عمل دخل اضطرار کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اور اس لئے وہ نت نئی صورتحال سے جلد ہی مطابقت پیدا کر لیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کی بے بسی ہی دراصل بلوغت کے زمانے میں ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی اہلیت کا باعث بنتی ہے۔ انسانی بچوں میں دوسرے حیوانات کے بچوں کے مقابلے میں کارآمد اضطراری اعمال بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ان میں (یعنی انسانی بچوں میں) مفید عادات اپنانے کا ملکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ عادات حالات کے مطابق ڈھلتی ہیں اور خلقی یا پیدائشی جبر سے آزاد ہوتی ہیں۔ یہ امر انسانی ذہانت کی وحشی جانوروں کی ذہانت پر فوقیت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

خواہش بڑی حد تک مشروطیت کی تابع ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ''الف'' ایک ابتدائی رخلقی خواہش ہے اور بہت سے مواقع پر ''ب'' نے ''الف'' کے لئے ایک ذریعے کا کام دیا ہے تو پھر ''ب'' کی خواہش بھی اسی طرح کی جانے لگتی ہے جیسے پہلے ''الف'' کی کی جاتی تھی۔ بلکہ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ''ب'' کی خواہش ''الف'' کی خواہش کا مکمل طور پر بدل بن جاتی ہے۔ اس کا مشاہدہ کنجوس آدمی میں کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب ''ب'' پر دسترس حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اسے ''الف'' کے حصول کے لئے ذریعے کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا۔ اگرچہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ بالعموم ''الف'' کی خواہش بھی برقرار رہتی ہے اگرچہ اب ''ب'' بھی مقصود بالذات کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

انسانوں میں ابتدائی خواہشات کی مشروطیت ہی ان کی زندگی کو حیوانوں سے متمیّز کرنے کا اصل سبب ہے۔ اکثر حیوان خوراک کی تلاش میں اس وقت نکلتے ہیں جب انہیں بھوک لگتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس تلاش کے دوران بھوکوں مر جائیں۔ اس کے برعکس انسان نے لازماً ابتداء ہی میں شکار میں ایک فنی لذت محسوس کرنا شروع کر دی ہو گی اور شکاری مہم پر بھوک لگنے سے بہت پہلے نکل کھڑا ہوتا ہو گا۔

بھوک کی مشروطیت میں اگلا قدم جانوروں کو پالنا تھا اور پھر اس سے اگلا قدم زراعت۔ آج بھی جب کوئی آدمی روزگار کی تلاش میں نکلتا ہے تو اس عمل کا تعلق بھوک ہی

سے ہوتا ہے۔ براہ راست نہ سہی۔ یہی حال ان دوسری ابتدائی خواہشات کا ہے جنہیں روپے کے ذریعے مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ گویا اب بھی یہی ابتدائی خواہشات قوت عمل کا سرچشمہ ہیں۔ اگرچہ ان کی قوت بہت سے ایسے وظائف میں بٹ چکی ہے جن کا بظاہر ان سے تعلق نظر نہیں آتا۔ آزادی اور اس سے وابستہ سیاسی سرگرمیوں ہی کو لیجیے۔ یہ اسی ابتدائی خواہش کا شاخسانہ ہیں جس کا مشاہدہ ڈاکٹر واٹسن نے ان بچوں کے غصے میں کیا تھا جن کے اعضاء آزاد نہ ہوں۔ چنانچہ اب بھی ہم جب حکومت کے سقوط یا عورت کی گراوٹ کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا تعلق بھی اسی خوف سے ہوتا ہے جو بچہ اس وقت محسوس کرتا ہے جب اسے بے سہارا چھوڑ دیا جائے۔

خواہش کے میدان میں اس خوش خرامی کے بعد ہم پھر ''علم'' کے موضوع کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ اصطلاح بھی خواہش سے ایک گونہ لزوم کی حامل ہے یہ بھی اسی عمل کے ایک دوسرے پہلو سے وابستہ ہے۔ وسیع معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک ایسا ردعمل جو کسی ایسے مہیج کے باعث وقوع پذیر ہو جس میں اوپر دی گئی تشریح کے پیش نظر خواہش کا عنصر موجود ہو علم کی ذیل میں آتا ہے۔ بشرطیکہ وہ قریب تریں اور آسان ترین راستے سے اس صورتحال کی طرف رہبری کرتا ہو جو کرداریت کے نقطہ نظر سے اس خواہش کا مقصود قرار پاتی ہے۔ اس طرح علم درجہ بندی کی ایک صورت ہے یعنی چوہا جیسے جیسے بھول بھلیاں میں کامیاب عمل کی طرف بڑھتا جاتا ہے وہ اسی حد تک زیادہ علم حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی ذہانت میں ترقی کی شرح کا تناسب وہی ہوگا جو تناسب اس وقت میں پایا جاتا ہے جو اس نے پہلی دفعہ بھول بھلیاں سے باہر آنے کی کوشش میں صرف کیا تھا اور جو وقت وہ اب اس کوشش میں صرف کرتا ہے اگر علم کی یہ تعریف قابل قبول ہو تو ایک اور نکتہ جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ خالصتاً تجریدی علم کا کوئی وجود نہیں۔ علم خواہش کی تسکین سے لازم و ملزوم ہے۔ جیسا ہم نے ابھی کہا ہے علم اس تسکین کے حصول کے صحیح ذرائع کے انتخاب کا نام ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ تعریف کارآمد بھی ہے یا نہیں۔ کیا یہ واقعی اس شے کی نمائندگی کرتی ہے جسے عرف عام میں علم کہا جاتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ تعریف بنیادی طور پر قابل قبول ہے۔ تاہم کچھ بحث طلب امور کی وضاحت ضروری ہے۔

بعض صورتوں پر اس تعریف کا اطلاق بظاہر واضح ہے۔ مثلاً چوہے اور بھول بھلیاں جیسی مثالیں جنہوں نے دراصل اس تعریف کی طرف ہماری رہبری کی تھی۔ فرض کیجئے آپ سے پوچھا جائے کہ کیا آپ ٹرافلگر چوک سے سینٹ پنکراس تک کا راستہ جانتے ہیں؟ یقیناً آپ جانتے ہیں بشرطیکہ آپ یہ راستہ کوئی غلط موڑ مڑے بغیر طے کر لیں۔ آپ اس قسم کے علم کے ''لفظی'' ثبوت بھی قدم بہ قدم راستہ طے کئے بغیر مہیا کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ ثبوت گلیوں سڑکوں اور ان کے ناموں کے باہمی لزوم پر منحصر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اصل چیزوں کی جگہ لفظوں کو ان کے بدل کے طور پر استعمال کرنے کے عمل کا ایک حصہ ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض اوقات الجھنیں بھی در آتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں ایک دفعہ بس میں وہائٹ ہال سٹریٹ سے گزر رہا تھا کہ ساتھ والی نشست سے ایک صاحب نے پوچھا۔ یہ کون سی گلی ہے میں حیران ہوا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تاہم میں نے بتایا کہ یہ وائٹ ہال ہے۔ اس نے پھر سوال کیا کہ یہ سامنے کون سی عمارت ہے' میں نے کہا ''دفتر خارجہ'' اس کے جواب میں اس نے کہا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ دفتر خارجہ ''ڈاوَننگ سٹریٹ'' میں ہے۔ اس دفعہ جو چیز میرے لئے حیرت کا باعث بنی وہ اس کی بے خبری نہیں بلکہ اس کا علم تھا۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے علم تھا کہ دفتر خارجہ کہاں واقع ہے؟ اس شخص کے مقصد کے حوالے سے اس سوال کا جواب ہاں بھی ہوسکتا ہے اور نہ بھی۔ یعنی اگر اس کا مقصد کوئی مراسلہ بھجوانا ہوتو اسے ''دفتر خارجہ'' کے محل وقوع کا علم تھا۔ لیکن اگر وہ خود چل کر وہاں جانا چاہے تو اسے یہ علم حاصل نہیں تھا۔ اصل میں وہ شخص جنوبی امریکہ میں برطانوی سفارت کار تھا اور پہلی دفعہ لندن آیا تھا۔

آیئے اب کچھ ایسے امور کا جائزہ لیتے ہیں جو بظاہر ہماری تعریف کے دائرہ عمل میں نہیں آتے۔ قارئین جانتے ہیں کہ کولمبس نے 1492ء میں سمندر کو عبور کیا تھا۔ یہاں ''جانتے ہیں'' کا مفہوم کیا ہے؟ بادی النظر میں اس طرح کے بیانات امتحان پاس کرنے کا ایک ذریعہ بنتے ہیں اور امتحان پاس کر لینا بھی ہمارے لئے اسی طرح مفید مطلب ہے جیسے چوہے کے لئے بھول بھلیاں سے باہر نکلنا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم صرف اسی مفہوم تک محدود نہیں رہتے۔ ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا امر واقعی ہے جس کے تاریخی ثبوت موجود ہیں۔ کم از کم میں یہ فرض کر لیتا ہوں۔ تاریخی شہادتیں طبع شدہ کتابیں یا مسودات مہیا کرتے

ہیں ان میں جو بیانات موجود ہوتے ہیں ان کو قبول کرنے کے لئے مورخین نے کچھ قواعد و ضوابط وضع کئے ہیں۔ میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ پیش نظر مثال میں شہادتیں ان قواعد وضوابط پر پوری اترتی ہیں۔ تاریخی حقائق کو اکثر زمانہ حال میں بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً تاریخی شواہد کی جانچ پڑتال کے لئے جو قواعد وضوابط وضع کئے گئے ہیں وہ اکثر باہم مربوط نتائج تک پہنچنے میں مد ثابت ہوتے ہیں۔ دو نتائج اس صورت میں باہم مربوط قرار پاتے ہیں جب وہ دونوں ایک ہی قسم کے عمل یا سلسلہ اعمال کے متقاضی ہوں۔ جو اس ایک حرکت کا حصہ ہوتے ہیں جو مقصود تک لے جاتی ہے۔ کیمبرج کے نزدیک کاٹن کے مقام پر ایک بورڈ ہے یا میرے زمانے میں ہوا کرتا تھا جس پر دو متضاد سمتوں میں اشارہ کرتے ہوئے دو افقی نشانات ہیں۔ دونوں پر ایک ہی عبارت ہے ''کیمبرج کی طرف''۔ یہ داخلی تضاد کی ایک واضح ترین مثال ہے۔ کیونکہ ہر دو نشانات ایسے بیانات پر مشتمل ہیں جو دو قطعی متضاد حرکات کو نمائندگی کرتے ہیں۔ اس مثال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ واقعی تضاد سے بچنا کیوں ضروری ہے۔ لیکن تضاد سے گریز ہمیں بہت گمبھیر تقاضوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ہیگل اور بریڈ لے تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم صرف اصول تضاد سے کائنات کی حقیقت کو جان سکتے ہیں۔ اس دعوے میں بیشک وہ کم و بیش یقین کی حد تک غلطی میں مبتلا تھے۔ بااین ہمہ ہمارا بہت سا علمی سرمایہ بہت حد تک اسی اصول کا مرہون منت ہے۔

ہمارے بیشتر ''علم'' کی حیثیت کھانا پکانے کی ترکیبوں پر مشتمل کتابوں جیسی ہے یعنی ایسے اصولوں کی دریافت جنہیں بوقت ضرورت کام میں لایا جا سکے۔ تاہم وہ ہمہ وقت کارآمد نہیں ہوتے چونکہ علم کسی وقت کارآمد بھی ثابت ہوسکتا ہے اس لئے ہم بتدریج مشروطیت کے زیر اثر علم کے لئے ایک خواہش پیدا کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسا ''عالم'' جسے عملی امور پر دسترس حاصل نہ ہو اس کا حال ایک کنجوس جیسا ہے کہ وہ (مقصود کی بجائے) صرف ایک ذریعے میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں تک مختلف مقاصد کا تعلق ہے۔ علم ان کے معاملے میں قطعاً غیر جانبدار ہوتا ہے۔

یوں سمجھئے کہ آپ کو سنکھیا کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ زہر قاتل ہے تو یہ علم آپ کے لئے محتاط رہنے یا خودکشی کرنے کے لئے یکساں مفید ہے۔ پہلی صورت میں آپ سنکھیا کے استعمال سے احتراز کریں گے اور دوسری صورت میں اسے استعمال کر لیں گے۔

اگر آپ کو یہ علم ہے کہ سنکھیا زہر قاتل ہے تو یہ علم آپ کو اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے سنکھیا کے استعمال سے مانع آئے گا لیکن اگر بصورت دیگر آپ خودکشی پر آمادہ ہیں تو پھر بھی یہی علم بروئے کار آئے گا۔ چنانچہ سنکھیا کے حوالے سے کسی شخص کے محض عمل سے آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اسے سنکھیا کے خواص کا علم ہے یا نہیں۔ اس آگاہی تک پہنچنے کے ئے اس کے مقاصد سے واقف ہونا ضروری ہے تو ہوسکتا ہے ایک شخص اپنی زندگی سے بیزار ہو لیکن وہ سنکھیا صرف اس وجہ سے استعمال نہ کرے کہ اسے بتایا گیا تھا کہ یہ ایک اچھی دوا ہے۔ اس صورت میں اس کا عمل دراصل ''علم'' سے بے بہرہ ہونے پر دال ہوگا۔

اب پھر کولمبس کی مثال کی طرف آیئے۔ تو قاری یقیناً اصرار کرے گا کہ کولمبس نے فی الحقیقت 1492ء میں بحراوقیانوس کو عبور کر لیا تھا اور اسی تیقن کی وجہ سے ہم اس بیان کو علم قرار دیتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ تو سچ کی تعریف ہے جبکہ وہ ایک ''امرواقعی سے مطابقت'' کا حامل ہو۔ میرے خیال میں اس تعریف میں ''صحت'' (یعنی صحیح ہونے) کا ایک اہم عنصر شامل ہے' لیکن یہ ایک ایسا عنصر ہے جسے ہم مادی دنیا کی حقیقت کے تجزیئے کے بعد ہی اخذ کر سکتے ہیں۔ تجربیت کے نقطہ نگاہ سے اس میں یہ خامی ہے کہ ہمارے پاس حقائق کو جاننے اور اپنے عقائد سے ان کا موازنہ و مقابلہ کرنے کا کوئی طریق کار موجود نہیں ہے۔ اس تگ و دو میں دراصل ہم بعض دوسرے عقائد تک ہی رسائی حاصل کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کرداری اور تجربی تعریف کے بغیر علم کی کوئی اور تعریف ممکن ہی نہیں۔ تاہم اگر ہم علم کو علت و معلول کے حوالے سے اہم گردانتے ہیں جس کا ثبوت ہیجان اور اس کے ردعمل میں پایا جاتا ہے تو پھر اس کے بغیر چارہ نہیں۔ انسان کا اس کے ظواہر کے حوالے سے مطالعہ کرنے کا یہی مناسب نقطہ نگاہ ہے اور اب تک ہم اسی پر عمل پیرا رہے ہیں۔

کرداری فلسفے کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہمیں اپنی پیش کردہ تعریف میں ایک ضروری اضافہ کرنا پڑے گا۔ ہم نے ابتداء تو احساس یا حاسہ سے کی تھی لیکن بعد میں ہماری تمام تر توجہ اس کسبی ردعمل پر مرکوز رہی جس میں آموزش یا کسب کا دارومدار تلازمہ پر ہوتا ہے۔ تاہم کسب یا آموزش کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ یا بظاہر مختلف طریقہ نظر آتا ہے۔ یعنی ذکاوت حس' احساس کا شدید تر' زود تر یا تیز تر ہو جانا۔ حیوانات اور انسان میں حس یا حاسہ کو ایک طرح کا علم ہی قرار دینا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک خاص مہیج کی

موجودگی میں ایک خاص طرح کا ردعمل ہی وقوع پذیر ہوتا ہے جو اس مہیج کی عدم موجودگی میں ظاہر نہیں ہو پاتا تو پھر یہ اہم نکتہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ رعدعمل مہیج کے متعلق ''علم'' کے باعث ہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اب دیکھئے کہ مشق اور ممارست (مثلاً موسیقی میں) حس کو ''حساس تر'' بنا دیتی ہے۔ یعنی مہیجات میں معمولی سا فرق بھی ردعمل کو متاثر کرنے لگتا ہے۔ اس سے بھی اہم تر امر یہ ہے کہ یہ اختلافات ازخود بھی ردعمل کے متقاضی بنتے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک وائلن نواز پنچم کے درمیان وقفے پر بالکل صحیح ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ اگر یہ وقفہ ذرا سا بھی کم وبیش ہو جائے اس کا سر تال پنچم کے حوالے سے بدل جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ہم مشق سے ہیئت یا صورت کے متعلق بھی زیادہ حساس ہوجاتے ہیں۔ احساس کی یہ ذکاوت یا سریع الحسی لازماً علم میں اضافہ شمار ہونی چاہیے۔

یوں کہنے سے ہم علم کی اپنی پہلی تعریف کے حوالے سے کسی تضاد کا شکار نہیں ہو رہے احساس صحیح ردعمل کے لئے لازمی شرط ہے۔ مثلاً کھانے پکانے کی ترکیبوں ہی کو لیجئے۔ کتاب میں صرف چٹکی بھر نمک لکھا ہوتا ہے لیکن اس مقدار کا تعین تو باورچی ہی جانتا ہے۔ یہ احساس ہی کی ایک مثال ہے۔ سائنس میں بھی مشاہدہ کی صحت جو بہت عملی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اسی احساس پر منحصر ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں سے ہمارے عملی رویئے کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ہم ان کے مزاج کا اندازہ نہیں کرسکیں گے تو لازماً باہم غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں گے۔

مشق سے حس، جس حد تک اصلاح پذیر ہوتی ہے وہ حیرت انگیز ہے شہری لوگ موسم کے سرد یا گرم ہونے کا اندازہ، اخبار کی رپورٹ دیکھ کر ہی لگاتے ہیں۔ حشرات الارض کا ماہر دیہات میں سفر کے دوران عام آدمی کے مقابلے میں کہیں زیادہ اقسام کے بھنورے دیکھ لیتا ہے۔ شراب یا تمباکو کی مختلف اقسام میں جس طرح نازک فرق کو ماہرین محسوس کر لیتے ہیں وہ ناتجربہ کار جوانوں کے لئے حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ حس میں یہ اضافہ قانون اشتلاف کے ذل میں آتا ہے یا نہیں۔ بہت سی حالتوں میں تو اس کا اطلاق واضح طور پر نظر آ جاتا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ تجریدی فکر اور بہت سے دوسرے معاملات میں، قانون اشتلاف کام نہیں دیتا یہاں تو گویا ایک نئی حسیت پیدا کرنے کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں علم کی ترقی کی حد تک حس کی ترقی یا اصلاح کو ایک آزاد عنصر کی

حیثیت ہی سے شامل کرنے کا حامی ہوں۔ وہ بھی بہت پس و پیش کے بعد۔

یہ بحث علم کی تعریف کے تمام ضروری پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتی۔ کئی اور نقطہ ہائے نگاہ بھی موجود ہیں جو اس مسئلے کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے یکساں طور پر اہم ہیں۔ تاہم سر دست انہیں مؤخر کرنا پڑے گا تا آنکہ ہم خارجی دنیا کی حقیقت پر غور کرنے کے بعد اس قابل ہو جائیں کہ انسان کا اس کے باطن کے حوالے سے مطالعہ کر سکیں۔

☆☆☆

زبان کا مسئلہ

زبان ایک ایسا موضوع ہے جس پر روایتی فلسفہ میں پوری احتیاط سے غور نہیں کیا گیا۔ اس بات کو ایک بدیہی امر کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا کہ خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ بالفعل موجود ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ خیالات کے ساتھ کچھ ایسے ''معروض'' بھی وجود رکھتے ہیں جنہیں الفاظ کے ''معانی'' کہا جاتا ہے جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ یہ بھی فرض کر لیا گیا تھا کہ زبان کے ذریعے ہم براہ راست اس کے مدلولات سے بھی عہدہ براء ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں الفاظ کی ان دو مفروضہ خصوصیات یعنی ''اظہار خیالات'' اور معروض پر ''دلالت'' کے محتاط تجزیئے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اکثر ہوتا یوں ہے کہ جب فلسفی بزعم خویش الفاظ کے معروضی مدلولات کا جائزہ لینے میں مصروف ہوتے ہیں تو دراصل وہ صرف الفاظ سے تعرض کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جب صرف الفاظ زیر بحث ہوتے ہیں تو وہ کم و بیش غیر شعوری طور پر اس غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ہر لفظ بجائے خود ایک اکائی ہے۔ حالانکہ دراصل وہ کم و بیش باہم متشابہ حالتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ زبان کے بالوضاحت تجزیئے سے صرف نظر کرنا ہی روایتی فلسفے کی بہت سی خامیوں کا ذمہ دار ہے۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ''معانی'' پر دسترس صرف اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب ہم زبان کو بھی ایک عضویاتی فعلیت خیال کریں۔ جس کی آموزش میں وہی طریق کار کام آتا ہے جو فٹ بال کھیلنے یا بائیسکل چلانے کی مہارت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک زبان کے مطالعہ کا صحیح طریق کار صرف وہی ایک ہے جو ڈاکٹر واٹسن نے متعارف کرایا ہے۔ بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ ''زبان کا نظریہ'' دراصل کرداریت کے حق میں سب

سے زیادہ مستحکم دلیل ہے۔

انسان کو حیوانات پر کئی طرح سے تفوق حاصل ہے۔ مثلاً آگ کا استعمال زراعت' آلات کا استعمال' جانوروں کو سدھانے کا ذکر میں اس لئے نہیں کرتا کہ یہ ملکہ تو چیونٹیوں کو بھی حاصل ہے۔ ان سب کے مقابلے میں زبان کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ زبان کب اور کیسے معرض وجود میں آئی اور نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ چمپینزی کیوں باتیں نہیں کرتے۔ یہ معاملہ بھی مشکوک ہے کہ تحریر اور تقریر میں سے کس کو اولیت حاصل ہے۔ غاروں میں کرومیگنان نسل کے انسانوں نے جو تصویریں بنائی ہیں ان کا مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ اظہار معانی ہو اور اس اعتبار سے بھی وہ ایک قسم کا رسم الخط ہوں۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تحریر' تصویروں ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ بہرحال یہ تاریخی عہد کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے عہد قبل از تاریخ میں تصویروں کو کس حد تک اطلاعات کی ترسیل یا احکام کے اجراء کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ جہاں تک گفتگو کی زبان کا تعلق ہے یہ حیوانات کی آوازوں سے اس اعتبار سے مختلف نوعیت کی حامل ہوتی ہے کہ یہ صرف اظہار جذبات کا ذریعہ ہی نہیں۔ حیوانات کے ہاں خوف کو ظاہر کرنے والی یا خوراک پا لینے پر خوشی کا اظہار کرنے والی یا اسی طرح کی اور آوازیں پائی جاتی ہیں جن سے وہ ایک دوسرے کے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جذبات کے علاوہ اور کسی کیفیت کو ظاہر کرنے سے معذور ہوتے ہیں اس صورت میں بھی ان کا اظہار صرف ان جذبات تک محدود ہوتا ہے جنہیں وہ بالفعل محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ ان کے ہاں بیانیہ جیسی کوئی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم بلامبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان ایک خاص انسانی ودیعت ہے اور شاید یہی وہ خاص الخاص صلاحیت ہے جس کی وجہ سے ہم گونگے حیوانوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

مطالعہ زبان کے آغاز میں تین امور غور طلب ہیں۔ اول یہ کہ ایک طبیعی وجود کی حیثیت سے الفاظ کی حقیقت کیا ہے؟ دوم یہ کہ وہ کون سے حالات ہوتے ہیں جو ہمیں ایک خاص لفظ استعمال کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ سوم یہ کہ لفظ کو سننے یا دیکھنے سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں' جہاں تک دوسرے اور تیسرے مسئلے کا تعلق ہے تو ہم دیکھیں گے کہ ان کا جائزہ لیتے ہوئے ہم لفظ سے آگے جملے تک آ گئے ہیں اور یوں نئے مسائل سے دوچار ہو گئے

ہیں۔فن کے مطالعہ کے لئے وضعی نفسیات کے طریق کار کا سہارا ناگزیر ہوگا۔

لفظ عام طور پر چار قسموں کے ہوتے ہیں۔ بولے گئے' سنے گئے' لکھے گئے' پڑھے گئے ان کے علاوہ اور کسی قسم کے لفظ استعمال کرنے کا رواج نہیں ہے۔ ورنہ یوں تو گونگے بہرے لوگوں کی زبان بھی ہے۔ ایک فرانسیسی کا کندھے اچکانا بھی تو ایک لفظ ہے۔حتیٰ کہ اعضاء کی نظر آنے والی کوئی حرکت بھی باہم معاشرتی اشتراک کے باعث لفظ کا کام دے سکتی ہے۔لیکن وہ روایت جس نے بولے ہوئے لفظ کو فوقیت عطا کی ہے اس کے لئے اہم وجوہات موجود ہیں کیونکہ نظر آنے والی مختلف جسمانی حرکات کو اتنی تیزی سے اور اتنی کم اعصابی قوت کے استعمال سے پیش کرنے کی اور کوئی صورت موجود نہیں ظاہر ہے کہ جلسے میں تقریر کرنا بہت دقت طلب ہوتا اگر سیاستدانوں کو گونگے بہرے لوگوں کی زبان استعمال کرنی پڑتی اور اگر ہر لفظ ادا کرنے کے لئے کندھے اچکانے جتنی مشقت بھی برداشت کرنا پڑتی تو اندازہ کیجئے کہ تقریر کس قدر تھکا دینے والا عمل بن جاتا۔ اس اعتبار سے چونکہ بولنے، سننے' لکھنے اور پڑھنے کے مقابلے میں باقی تمام صورتیں نسبتاً غیر اہم ہیں اور کوئی خاص نفسیاتی مسئلہ بھی پیش نہیں کرتیں اس لئے میں ان سب سے صرف نظر کرتا ہوں۔

بولا ہوا لفظ۔ تالو اور منہ کے اندر سانس کے ساتھ مل کر حرکات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ باہم مشابہت رکھنے والی حرکات کے دو سلسلے ایک ہی لفظ کی ادائیگی پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ تاہم اس کے برعکس بھی ممکن ہے۔ کیونکہ بعض اوقات دو ''لفظ'' صوتی مناسبت کے باوجود مختلف معانی کے حامل ہوتے ہیں۔لیکن مختلف حرکات کے دو ایسے سلسلے' جن میں باہمی مشابہت' موجود نہ ہو' انہیں ایک ہی لفظ کی ادائیگی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (واضح رہے کہ میرے پیش نظر ایک ہی زبان ہے) چنانچہ ایک لفظ باہم بہت زیادہ مشابہ جسمانی حرکات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ اور ہر دفعہ جب یہ لفظ دہرایا جاتا ہے تو انہی حرکات کا مطلوبہ تعداد پر مشتمل مجموعہ تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ مثلاً ''قہوہ'' کا لفظ' ان حرکات میں کس حد تک مشابہت ہونی چاہئے تا کہ مطلوبہ لفظ قہوہ ادا ہو سکے۔ اس کا تعین مشکل ہے۔ہمیں ماننا پڑے گا کہ کچھ لوگ اسے ''کہوہ'' کی شکل میں ادا کرتے ہیں۔لیکن جب اس کا تلفظ ''کافی'' کیا جائے تو پھر ہم تذبذب میں پڑ جائیں گے۔ اس لئے ملتے جلتے الفاظ کے معاملے میں ہم یہ طے نہیں کر سکتے کہ ایک خاص لفظ بولا گیا ہے یا نہیں۔ بولا ہوا لفظ عضوی وظائف کا ایک ایسا

سلسلہ ہوتا ہے جس کی حدود کو سختی سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ چھلانگ لگانے' اچھلنے یا تیز دوڑنے کا معاملہ ہے۔ کیا یہ شخص دوڑ رہا ہے۔ یا چل رہا ہے؟ تیز چلنے کا مقابلہ میں ریفری کے لئے اس کا فیصلہ مشکل ہوگا چنانچہ بعض مثالیں ایسی ہوسکتی ہیں جہاں یہ طے کرنا مشکل ہو کہ بولنے والے نے کونسا لفظ ادا کیا ہے۔ اسی لئے بولا ہوا' لفظ بیک وقت عموم کا حامل بھی ہوتا ہے اور کسی حد تک ابہام کا بھی۔

عام طور پر ہم بولے ہوئے لفظ اور سنے ہوئے لفظ میں ہم رشتگی کو فرض کر لیتے ہیں۔ ہم باہم ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کیا تم سنتے ہو جو میں کہہ رہا ہوں۔ اور جواب ملتا ہے۔ ہاں سن رہا ہوں۔ دراصل یہ ایک مغالطہٰ ہے' کائنات کی معروضیت کے متعلق ہمارے بلا سوچے سمجھے بچگانہ ردعمل کا ایک حصہ۔ دراصل ہم کبھی وہ نہیں سنتے جو کہا گیا ہے۔ ہمارے سننے میں تو صرف وہ کچھ آتا ہے جسے کہے گئے لفظ سے ایک الجھا ہوا علی تعلق ہوتا ہے۔ پہلے مرحلے میں تو بولنے والے شخص کے منہ سے برآمد ہونے والی صوتی لہروں کا خالصتاً طبیعی سلسلہ ہوتا ہے جو گوش شنوا تک پہنچتا ہے۔ پھر کان کے اندر اعصاب میں ایک پیچیدہ سلسلہ مترتب ہوتا ہے۔ اس کے بعد دماغ میں ایک عمل وقوع پذیر ہوتا ہے جو آواز کے سنے جانے سے ایک خاص رشتے میں منسلک ہوتا ہے جس کا جائزہ بعد میں لیا جائے گا۔ تاہم یہ سماعت کے ساتھ بیک وقت وارد ہوتا ہے۔ بولے ہوئے لفظ اور سنے ہوئے لفظ کے مابین طبیعی علی تعلق کی حقیقت بس اتنی ہے۔ اس کے علاوہ نفسیاتی نوعیت کا ایک اور تعلق بھی ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص ایک لفظ ادا کرتا ہے تو وہ اسے خود بھی سنتا ہے۔ اس طرح بولا ہوا لفظ اور سنا ہوا لفظ' اس شخص کے لئے جو بول سکتا ہے' باہم گہری وابستگی کے حامل بن جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص بولنا جانتا ہے' وہ اپنی زبان کے سنے ہوئے لفظ کو دہرا بھی سکتا ہے۔ چنانچہ گفتہ اور شنیدہ لفظ میں باہمی دوطرفہ (دوگونہ) ربط قائم ہو جاتا ہے۔ ربط باہم کی اسی گہرائی کے باعث عام آدمی سادہ دلی سے گفتہ لفظ کو شنیدہ لفظ پر منطبق کر لیتا ہے۔ حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔

گفتگو کے کارآمد ہونے کے لئے نہ تو یہ ضروری ہے اور نہ ہی ممکن ہے کہ گفتہ اور شنیدہ لفظ ایک دوسرے پر منطبق ہوں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ جب کوئی شخص مختلف الفاظ ادا کرے تو سنے ہوئے لفظ بھی باہم مختلف ہوں۔ اور اگر وہ ایک ہی لفظ دہرائے تو ہر دفعہ سنا

ہوا لفظ بھی کم و بیش ایک جیسا ہو۔ پہلی صورت میں سماعت کی ذکاوت پر بولنے والے اور سننے والے اشخاص کے درمیانی فاصلے کو بھی دخل ہے۔ کیونکہ زیادہ دوری پر ہم شاید الفاظ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ دوسری شرط کا دارومدار طبیعی حالات کی یکسانیت پر ہے۔ جو عام حالات میں اکثر میسر ہوتی ہے۔ لیکن اگر بولنے والا ایسے سازوں میں گھرا ہوا ہو' جو بعض آوازوں کو تو بڑھاوا دیں اور بعض کو دبا دیں تو آواز کے زیروبم کے بعض حصے تو اجاگر ہو جائیں گے اور بعض دب کر رہ جائیں گے۔ اس صورت میں اگر وہ ایک ہی لفظ کو لحن بدل کر ادا کرے تو سننے والا ان کی باہمی یگانگت کو نہ پا سکے گا۔ چنانچہ گفتگو کی کارکردگی کئی ایک طبیعی حالات سے مشروط ہے۔ سردست ہم ان کی موجودگی کو تسلیم کر لیتے ہیں تاکہ اپنے موضوع کے نفسیاتی پہلوؤں تک جلد از جلد رسائی حاصل کر سکیں۔

لکھے ہوئے لفظ بولے ہوئے لفظ سے اس حیثیت میں مختلف ہوتے ہیں کہ اول الذکر ایک مادی خارجی ڈھانچہ بھی رکھتے ہیں۔ جبکہ بولا ہوا لفظ مادی دنیا میں ایک عملی سلسلہ ہے۔ جو ایک لازمی زمانی تسلسل رکھتا ہے۔ لکھا ہوا مادی لفظ مادی اجزاء کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو ایک لازمی مکانی علاقہ رکھتا ہے۔ یہ سوال کہ یہاں مادہ سے ہماری کیا مراد ہے' اس سے بعد میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔ سردست یہی جان لینا کافی ہے کہ وہ مادی ڈھانچہ جس پر لفظ مشتمل ہوتا ہے' اس سلسلہ عمل کے برعکس جو بولے ہوئے لفظ کی تشکیل کرتا ہے، زیادہ دیر تک بعض حالتوں میں ہزاروں سال تک برقرار رہنے کا اہل ہوتا ہے۔ یہ کسی ایک ماحول تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اسے پوری دنیا میں پھیلایا جا سکتا ہے۔ (شائع کیا جا سکتا ہے۔) تحریر کو تقریر پر دوگونہ فوقیت حاصل ہے۔ تاحال کم از کم صورتحال یہی رہی ہے' لیکن ریڈیو (1) کی ایجاد نے تحریر کی برتری ختم کر دی ہے۔ اب ایک شخص پورے ملک میں گروہ در گروہ پھیلے ہوئے لوگوں سے خطاب کر سکتا ہے۔ اب تو تقریر دوام کے معاملے میں بھی تحریر کی ہم پلہ ہو چکی ہے۔ اب تو شاید قانونی وثیقوں کی بجائے ہم گراموفون ریکارڈ رکھنے لگیں گے۔ جن پر فریقین کی آوازوں کے ''دستخط'' ثبت ہوں گے۔ شاید ایچ جی ویلز کی کہانی ''جب سویا ہوا بیدار ہوگا'' کے مطابق کتابیں چھاپی نہیں جائیں گی بلکہ انہیں صرف گراموفون کے ریکارڈوں میں منضبط کرنے کے لئے ترتیب دیا جائے گا۔ اس حالت میں لکھنے کی ضرورت تقریباً ختم ہو جائے گی۔ خیر ان اندازہ دانیوں کو ہمیں چھوڑ کر ہم واپس زمانہ حال کی طرف

لوٹتے ہیں۔

لکھے ہوئے یا چھپے ہوئے لفظ کے مقابلے میں پڑھا ہوا لفظ بھی بولے ہوئے یا سنے ہوئے لفظ کی طرح ناپائیدار ہے۔ جب بھی ایک لکھے ہوئے لفظ پر روشنی منعکس ہوتی ہے اور وہ معمولی آنکھ سے ایک مناسب مکانی تعلق پیدا کرتا ہے تو وہ آنکھ پر ایک خاص پیچیدہ اثر مرتب کرتا ہے۔ اس عمل کا وہ حصہ جو آنکھ سے، ماوراء خارج میں ظہور پذیر ہوتا ہے، اس کا مطالعہ روشنی کی سائنس سے تعلق رکھتا ہے۔ جو عملاً پردہ چشم پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ بصری عضویات کا موضوع ہے۔ ان کے بعد ایک اور سلسلہ پہلے تو بصری عصب اور پھر دماغ میں ترتیب پاتا ہے۔ دماغی عمل بصارت کے ساتھ بیک وقت وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس زمانی توارد کے علاوہ ذہنی عمل کا بصارت سے کیا رشتہ ہوتا ہے۔ اس پر لمبی چوڑی فلسفیانہ بحثیں ہو چکی ہیں۔ تاہم اس کا مطالعہ ہم بعد میں کریں گے۔ جہاں تک عملی حیثیت سے تحریر کی برتری کا تعلق ہے اس کا مرکزی نکتہ صرف یہ ہے کہ تحریر کا عمل نیم مستقل مادی ساخت مہیا کرتا ہے۔ جو جب تک باقی رہتی ہے۔ مناسب زاویہ سے ہر معمولی آنکھ پر کم وبیش ایک ہی جیسے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اور تقریر کی طرح مختلف لکھے ہوئے لفظ بھی مختلف پڑھے جانے والے لفظوں کی طرف رہبری کرتے ہیں۔ اور ایک ہی مکرر لکھا ہوا لفظ ہر دو حالتوں میں خاص حدود کے اندر ایک ہی پڑھے گئے لفظ کی طرف رہبری کرتا ہے۔

یہ تو تھی زبان کے معروضی پہلو کی بات۔ جسے بالعموم بجا طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اب ہم نفسیاتی پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو فی الاصل ہمارا موضوع ہے۔

الفاظ کے مقابلے میں جملوں یا فقروں سے پیدا ہونے والے مسائل سے قطع نظر یہاں ہمیں دو سوالوں کے جواب مہیا کرنا ہوں گے۔ اوّل یہ کہ ایک لفظ سننے پر کس قسم کے ردِعمل کو تحریک ہوتی ہے؟ دوسرے یہ کہ وہ کیا صورت حال ہوتی ہے جو اس عمل کا محرک بنتی ہے جو ایک خاص لفظ بولنے یا کہنے پر مشتمل ہوتا ہے؟ میں نے سوالوں کی یہ ترتیب اس وجہ سے قائم کی ہے کہ بچے دوسروں سے سنے ہوئے لفظوں پر، پہلے ردِعمل کا اظہار کرنے لگتے ہیں خود لفظ ادا کرنا بعد میں سیکھتے ہیں۔ یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ نوع انسان کی تاریخ میں پہلے پہل بولے جانے والے لفظ کو پہلے پہل سنے ہوئے لفظ پر (چند لمحوں ہی کا سہی) تقدم حاصل ہوتا ہے۔ تاہم یہ بات خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ اور اپنی جگہ یقینی طور پر

درست بھی نہیں۔ ''شور'' ایک سننے والے شخص کے لئے معانی کا حامل ہو سکتا ہے۔ جبکہ شور کرنے والے کے لئے نہیں۔ اس اعتبار سے شور ایک سنا ہوا لفظ تو ہو سکتا ہے نہ کہ بولا ہوا لفظ۔ معانی سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس کی صراحت تھوڑی دیر بعد کروں گا۔ فرائی ڈے (2) کے قدموں کے نشانات رابن سن کروسو کے لیے تو معنی رکھتے تھے لیکن خود فرائی ڈے کے لئے نہیں۔ بہرحال بہتر یہی ہو گا کہ ہم بشریات کے بکھیڑوں میں نہ پڑیں۔ اور براہ راست زمانہ حال میں بچوں کے زبان سیکھنے کے عمل کا مطالعہ کریں۔ اور یہ تو ہم جان ہی چکے ہیں کہ انسانی بچہ دوسروں کے الفاظ پر واضح ردعمل کا اظہار خود الفاظ ادا کرنے کی صلاحیت حاصل کرنے سے بہت پہلے شروع کر دیتا ہے۔

بچہ لفظوں کا مفہوم بھی بعینہ اسی طرح سمجھنے لگتا ہے جیسے وہ دوسرے عضوی اعمال کے سلسلوں کو اخذ کرتا ہے۔ آپ جب بھی بچے کو دودھ کی بوتل دیں تو اگر ساتھ ہی بوتل کا لفظ بھی دہراتے ہیں تو وہ جلد ہی اس لفظ پر اپنے ردعمل کا اظہار بہت حد تک اسی طرح کرنے لگتا ہے جس طرح وہ پہلے بوتل دیکھ کر کیا کرتا تھا۔ یہ اصول تلازمات کی ایک عام سی مثال ہے۔ جب یہ تلازمہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ تو والدین یہ کہتے ہیں کہ بچہ لفظ ''بوتل'' کو سمجھنے لگا ہے۔ یا وہ یہ جانتا ہے کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ ان تمام اثرات کا حامل نہیں ہوتا جو بوتل سے وابستہ ہیں۔ کشش ثقل یہاں کارفرما نہیں ہوتی۔ (یعنی لفظ وزن سے عاری ہوتا ہے) اس سے بچے کی خوراک کی ضرورت بھی پوری نہیں ہوتی۔ یہ بچے کی پیشانی سے ٹکرا نہیں سکتا۔ لفظ اور اس کے مدلول میں جو تاثرات مشترکہ ہوتے ہیں' ان کا دارومدار صرف قانون اشتلاف یا مشروط اضطرار یا کسبی (اکتسابی) ردعمل پر ہوتا ہے۔ انہیں ہم تلازمات تاثرات یا حافظے کے ارتسامات کہہ سکتے ہیں۔ موخر الذکر ترکیب سیمن کی کتاب Mneme سے مستعار لی گئی ہے جس میں وہ حافظے سے مماثل تمام معروضات کو ایک ایسے اصول کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو بالفعل اصول تلازمات یا مشروط اضطرار سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

تاثرات کے جس مجموعے یا سلسلے کا یہاں ذکر ہو رہا ہے' ان کو زیادہ صحت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک مادی معروض گویا ایک مرکزی نکتہ ہوتا ہے۔ جس سے بہت سے متفرق علی رشتے جنم لیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک ''شے'' جان سمتھ کو نظر

آ رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے تو یہ روشنی کی لہروں (مقدار نور) پر مشتمل ہوتی ہے جو اس شے سے چل کر جان سمتھ کی آنکھوں تک پہنچتی ہیں۔ پھر پردہ چشم اور بصری عصب میں کچھ ارتسامات رونپذیر ہوتے ہیں۔ پھر دماغ میں۔ تب کہیں جا کر وہ کسی ردعمل پر منتج ہوتے ہیں۔ حافظے کے ارتسامات کا تعلق زندہ نسیجوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے بوتل کے متعلق صرف وہی تاثرات جو جان سمتھ کے جسم کے اندر واقع ہوتے ہیں یا جو ردعمل کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ بوتل کا لفظ سننے کے عمل کے ساتھ تلازمات کے سلسلے قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بھی صرف معدودے چند۔ مثلاً تغذیہ کا عمل جسم کے اندر واقع ہوتا ہے۔ تاہم لفظ ''بوتل'' فی نفسہ تغذیہ کا کام نہیں دیتا۔ مشروط اضطراری اعمال کا اصول بعض واضح حدود کا پابند ہوتا ہے اور ان حدود کے اندر ہی وہ لفظوں کی تفہیم میں عملاً ممد ثابت ہوتا ہے۔ بچہ جب بوتل کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ یہ خود ایک مشروط اضطراری عمل ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ تجربے کی رو سے بوتل کا نظر آنا خوراک کے حصول سے پہلے کا ایک مظہر ہے' اس کے بعد دوسرے مرحلے میں جب بچہ بوتل کا لفظ سن کر اسی ہیجان کا مظاہرہ کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ اس لفظ کو سمجھنے لگا ہے۔

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشروط اضطرار کے اصول کے نکتہ نظر سے جب ایک لفظ سن کر وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں' جنہیں اس لفظ کے مفہوم سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ شخص اس لفظ کو سمجھتا ہے۔ یہ بات البتہ صرف ایسے الفاظ پر صادق آتی ہے جو کسی معروضی شے یا اشیاء کے سلسلے کو ظاہر کرتی ہیں جیسے بوتل' لیکن کسی ایسے لفظ کو سمجھنا جیسے ''تعامل'' یا جمہوریت۔ زیادہ پیچیدہ عمل ہے۔ اس پر غور کرنے سے پہلے جملے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ تاہم جملے سے بھی پہلے جاننا ضروری ہے کہ وہ کیا صورت حال ہوتی ہے جو کسی لفظ کے معنے جاننے کے نتائج کے بالمقابل اس کے استعمال پر منتج ہوتی ہے۔

ان چند لفظوں کی آوازوں کے علاوہ' جو بچے اس وقت نکالتے ہیں جب ابھی وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ لفظ ہیں مثلاً ما' ما' دا' دا لفظ کا استعمال لفظ کے سمجھنے سے مشکل تر عمل ہے۔ جن دو آوازوں کی مثال ہم نے دی ہے یہ ان چند آوازوں میں سے ہیں جنہیں اتفاقیہ طور پر سبھی بچے ادا کرتے ہیں۔ جب بچہ اپنی ماں کی موجودگی میں ما' ما' کا اعادہ کرتا ہے تو وہ اتفاق سے فرض کر لیتی ہے کہ بچہ جانتا ہے کہ اس آواز کا مطلب کیا ہے۔ وہ اس پر اس طرح اپنی

خوشی یا پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے جو بچے کے لئے خوشگوار ہوتی ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ تھارن ڈائیک کے پیش کردہ اصول تاثر کے ماتحت بچہ ماں کی موجودگی میں یہ آواز دہرانے کی عادت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم اس طریقے سے اخذ کردہ الفاظ کی تعداد بہت محدود ہے۔ لفظوں کی کثیر مقدار تو نقل نیز لفظ اور اس کے مدلول کے مابین ربط کے ذریعے اخذ کی جاتی ہے۔ یہ ربط والدین شعوری طور پر ابتداء ہی سے قائم کرے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ از خود لفظ کا استعمال لفظ کی آواز اور اس کے مدلول کے مابین تلازمہ سے کچھ زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کتے بھی بہت سے لفظ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور چھوٹے بچے جتنے لفظ ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ تعداد میں الفاظ کو سمجھنے کے اہل ہوتے ہیں۔ بچہ یہ جان لیتا ہے کہ جو آوازیں وہ سنتا ہے ان کا دہرانا ممکن بھی ہے اور سودمند بھی ہے۔ (تاہم اس بات کو بالکل لغوی معنی پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ بہت زیادہ عقلیت پسندانہ نظر آئے گی) بچہ یہ بات کبھی نہ جان پاتا اگر وہ گفتگو کے ارادے کے بغیر الل ٹپ آوازیں نکالنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح وہ آہستہ آہستہ یہ جان جاتا ہے کہ وہ اس طرح کی آوازیں نکال سکتا ہے۔ جیسی کہ وہ سنتا ہے اور بالعموم اس عمل کے نتائج خوش آئند ہوتے ہیں۔ والدین بھی خوش ہوتے ہیں اور مطلوبہ اشیاء بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ اور شاید ان سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بالارادہ آواز نکالنا اناپ شناپ آوازوں کے مقابلے میں ایک طرح کے احساس قوت سے مملو ہوتا ہے۔ تاہم اس سارے عمل اور چوہے کے بھول بھلیاں، یا پنجرے سے باہر آنے کے عمل آموزش میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ کوہلر نے بندروں پر جو تجربات کئے ہیں' ان کے برعکس چوہے اور پنجرے والے عمل سے یہاں زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ صرف ذہانت کسی حال میں بھی بچے کو یہ اہلیت عطا نہیں کر سکتی کہ وہ چیزوں کے نام دریافت کر لے۔ پنجرے میں حیوانوں کے معاملہ میں بھی یونہی ہوتا ہے۔ صرف تجربہ ہی یہاں کام آتا ہے۔

جب کوئی شخص بولنا سیکھ لیتا ہے تو اب مشروطیت کا عمل دوسروں کی بات سمجھنے کی عمل کے برعکس ایک متضاد جہت میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ بلی کو دیکھ کر ایک شخص جو بول سکتا ہے قدرتی طور پر ''بلی'' کا لفظ ادا کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ خواہ کسی وجہ سے عملاً وہ ایسا نہ بھی کرے۔ تاہم یہ بھی درست ہے کہ بلی کو دیکھے بغیر صرف اس کے متعلق سوچنے پر وہ یہ لفظ

زبان پر لائے۔ ہم ابھی دیکھیں گے کہ دراصل یہ بھی اسی مشروطیت کے عمل کا ایک اگلا مرحلہ ہے۔ میرے نزدیک جملوں کے مقابلے میں مفرد لفظ کا استعمال پوری طرح اسی اصول سے واضح ہو جاتا ہے جو بھول بھلیوں میں حیوانات کے عمل کی وضاحت کرتا ہے۔

بعض فلسفی جو تجزیاتی طریق کار کے قائل نہیں یہ کہتے ہیں کہ جملے پہلے استعمال میں آتے ہیں اور مفرد لفظ بعد میں' اس ضمن میں بھی ہمیشہ پنٹاگون کی زبان کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس زبان سے ان کے مخالفین واقف ہی نہیں ہوتے ہمیں یہ بتایا جاتا ہے باور کرایا جاتا ہے کہ اگر آپ پنٹاگون کے کسی باشندے سے یوں کہیں کہ میں اس جھیل پر مچھلی کے شکار کے لئے جا رہا ہوں جو مغربی پہاڑوں کے پیچھے واقع ہے تو وہ آپ کا مطلب سمجھ جائے گا۔ لیکن صرف ''مچھلی'' کا لفظ اس کے لئے قابل فہم نہیں ہے۔ (یہ ایک فرضی مثال ہے تاہم یہ ان کے طرز استدلال کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے) اب یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ پنٹاگون کے باشندے اس ذیل میں استثنا کی حیثیت رکھتے ہوں۔ اصل قصہ ہے بھی یونہی ورنہ وہ پنٹاگون میں رہنے کو کیوں ترجیح دیتے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ متمدن دنیا میں بچے یوں نہیں کرتے۔ صرف ٹامس کارلائل اور لارڈ میکالے کے معاملے میں اس کے برعکس ہوا تھا۔ روایت یوں ہے کہ اول الذکر نے تین سال کی عمر تک مطلقاً کوئی بات نہیں کی جب اچانک اپنے چھوٹے بھائی کو روتے ہوئے دیکھ کر وہ کہہ اٹھا ''ننھے جیک کو کیا تکلیف ہے۔'' رہا لارڈ میکالے تو اس کی نغمہ سرائی ایک تکلیف دہ حادثے کا نتیجہ تھی۔ اس نے ایک ضیافت کے دوران گرم گرم چائے اپنے اوپر گرا لی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے تکلم کا آغاز اپنی میزبان خاتون سے یہ کہہ کر کیا۔ شکریہ بیگم صاحبہ! اب تکلیف کم ہو گئی ہے۔ تاہم یہ سوانح نگاروں کے قصے ہیں۔ بچپن میں زبان سیکھنے سے ان کا تعلق بس واجبی سا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنے بچوں کے حالات کا احتیاط سے مطالعہ کیا گیا ہے ان سب نے مفرد لفظ کا استعمال پہلے سیکھا جملوں کا بہت بعد میں۔

ابتداء میں بچوں کو دو مشکلات پیش آتی ہیں۔ ایک حروف کی آوازیں ادا کرنے کی صلاحیت اور دوسرے کسبی یا اکتسابی تلازمات کی قلت۔ مجھے یقین ہے کہ ما۔ ما۔ با۔ دا۔ دا سے جو مفہوم منسوب کیا جاتا ہے اس کی تہہ میں یہ رمز کارفرما ہے کہ یہ ایسی آوازیں ہیں جو بچے از خود بہت چھوٹی عمر میں ادا کرنے لگتے ہیں۔ (بغیر سیکھے یا نقل کئے) اس لئے بڑوں

کے لئے انہیں مخصوص معانی عطا کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔تکلم بالکل ابتدائی سطح پر بڑوں کی نقالی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بڑوں کی نقالی کی بجائے اس دریافت کا عمل ہوتا ہے کہ ازخود نکالی ہوئی آوازوں کے نتائج خوشگوار ہوتے ہیں۔ نقالی تو اس وقت در آتی ہے جب بچے کو یہ شعور ارزانی ہوتا ہے کہ آوازوں کے معانی بھی ہوتے ہیں۔ گویا تکلم میں مہارت اسی عمل کے مترادف ہوتی ہے جو کسی کھیل کے سیکھنے میں کام آتا ہے یا بائیسکل چلانے میں۔

لفظ و معنی کا یہ نظریہ ایک سادہ فارمولے میں یوں ڈھالا جا سکتا ہے کہ جب مشروط اضطراری اعمال کے نظریئے کے مطابق ۔ج کی ایک علت ٹھہرتا ہے تو ہم یوں کہیں گے کہ ا۔ج کی تلازماتی علت ہے۔ اور ج۔ا کا تلازماتی معلول۔ چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک خاص شخص کے لئے لفظ ''ا'' جب وہ اسے سنتا ہے' تو اس کا مدلول ج ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ا کے تلازماتی ارتسامات ۔ ج کے ارتسامات کے مشابہ ہوں۔

اور اسی طرح اگر لفظ ''ا'' کی ادائیگی ''ج'' سے تلازماتی سلسلہ میں وابستہ ہے تو پھر ا کہنے سے مراد ج ہوتی ہے یا کوئی اور شے جو پہلے سے ج کے ساتھ بطور لزوم وابستہ ہو۔ اسی بات کو زیادہ معروضی انداز میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ لفظ پطرس کا مدلول ایک خاص شخص ہوتا ہے۔ بشرطیکہ لفظ پطرس سننے کے تلازماتی تاثرات' پطرس کو دیکھنے کے مشابہ ہوں۔اور لفظ پطرس کہنے کا تلازماتی سبب وہ وقوعات ہوں جو پہلے سے پطرس کے ساتھ ملزوم ہوں۔ البتہ جوں جوں ہمارا تجربہ بڑھتا ہے اور زیادہ تہہ دار ہوتا چلا جاتا ہے' اسی حساب سے یہ سادہ تعلق بھی الجھتا چلا جاتا ہے۔ اور زیادہ گمبھیر ہوتا جاتا ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور پر اس کی صحت اور سچائی متاثر نہیں ہوتی۔

سی کے آگدن اور آئی۔اے رچرڈز نے ایک دلچسپ اور قابل قدر کتاب بعنوان ''معنی کے معنی'' لکھی ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس کتاب میں صرف لفظوں کے استعمال سے بحث کی گئی ہے۔ ان سے پیدا ہونے والے تاثرات کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ یہ اصول بالا کے صرف ایک رخ کو پیش کرتی ہے' اور وہ بھی نامکمل صورت میں۔ اس کتاب کی رو سے ایک لفظ اور اس کے معنی ایک ہی سبب کے مرہون ہوتے ہیں۔لیکن میں یہاں فعال معانی (یعنی لفظ بولنے والے شخص کی مراد) اور انفعالی معانی (یعنی سننے والا شخص اس سے کیا مراد لیتا ہے) میں تفریق روا رکھتا ہوں۔ فعال معانی میں لفظ کی تلازماتی علت اس کا مفہوم یا

مدلول ہوتا ہے یا اسی کے متعلقات۔ جبکہ انفعال معانی میں تلازماتی تاثرات یا ارتسامات' صرف ایک خاص حد تک ہی مفہوم یا مدلول سے یکسانی کے حامل ہوتے ہیں۔

کرداریت کے اصولوں کے مطابق اسم معرفہ اور اسم حاصل مصدر یا اسم جنس میں کوئی اہم تفریق موجود نہیں ہے۔ بچہ لفظ ''بلی'' کا استعمال جو اسم نکرہ ہے اسی طرح سیکھتا ہے جس طرح لفظ پطرس کا استعمال۔ لیکن حقیقت میں لفظ پطرس متعدد مختلف امور پر محمول ہوتا ہے اور ایک لحاظ سے عمومیت کا بھی حامل۔ پطرس نزدیک بھی ہوسکتا ہے اور دور بھی' کھڑا ہوا۔ بیٹھا ہوا' ہنستا ہوا' یا خشمگیں بھی ہوسکتا ہے۔ یہ سب حالتیں مختلف نوعیت کے مہیجات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ تاہم ان میں باہم اتنا اشتراک ضرور پایا جاتا ہے کہ سب کی سب ایک ردعمل پیدا کریں جس کا مرکزی حوالہ لفظ پطرس بنتا ہے۔ اسی لئے کرداریت کے نکتہ نظر سے پطرس اور آدمی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہاں مہیجات میں لفظ پطرس کے متعلقات سے زیادہ نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ بمقابلہ لفظ آدمی کے۔ تاہم یہ صرف مراتب کا فرق ہے۔ ہمارے پاس پطرس کی ان سب گریز یا حقیقتوں کے لئے الگ الگ لفظ نہیں ہیں جو پطرس کی نمائندگی کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ کسی عملی اہمیت کی حامل نہیں۔ دراصل ان میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ نظریاتی یا فلسفیانہ نوعیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں ان کے متعلق بہت کچھ کہنا پڑے گا۔ لیکن ابھی اس کا موقعہ نہیں آیا۔ سردست صرف یہ جان لینا چاہئے کہ پطرس کے ایک ذات کی حیثیت سے بہت سے لزومات ہیں اور اسی طرح سے لفظ پطرس کے بھی مختلف لزومات ہیں۔ ان دونوں لزومات کے مجموعوں میں اس شخص کے لئے جو پطرس کو دیکھتا ہے' بہت سی مشابہتیں موجود ہوتی ہیں۔ ان دونوں میں ایک فرق ہے کہ پطرس کی ذات سے تعلق رکھنے والی نسبتیں ایک علی تعلق کی حامل ہوتی ہیں۔ جبکہ لفظ پطرس کے متعلقات کی نسبت' مشابہت پر استوار ہے۔ تاہم سردست یہ فرق ہمارا موضوع نہیں ہے۔

عام لفظ (یا اسمائے نکرہ) مثلاً آدمی' بلی یا مثلث کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کل پر دلالت کرتے ہیں۔ کلیات کے متعلق فلسفہ میں افلاطون کے زمانے سے لے کر آج تک مباحث کا سلسلہ جاری ہے۔ کلیات اگر کچھ حقیقت رکھتے ہیں تو اس کی نوعیت کیا ہے۔ دراصل اس سوال کا تعلق فلسفے سے ہے۔ زبان کے استعمال کے ضمن میں اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ کلیات کے متعلق ایک نکتہ یہاں غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ ان کے صحیح استعمال پر قادر ہونے کا

مطلب یہ نہیں کہ ان الفاظ کو استعمال کرنے والا کلیات کے مفہوم پر بھی حاوی ہے۔ یہ اکثر فرض کر لیا جاتا ہے کہ چونکہ ہم ایک لفظ مثلاً انسان کو صحیح طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ تو لازماً ہم اس کے ساتھ منسلک مجرد کلیہ پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بداہتاً غلط ہے عملاً بعض ردعمل ایک انسان کے لئے موزوں ہوتے ہیں بعض دوسرے کے لیے۔ تاہم ان سب میں بعض جزئیات مشترک ہوتی ہیں۔ اگر یہ لفظ صرف ردعمل کے مشترکہ اجزاء کی تحریک کا باعث بنتا ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس لفظ ''انسان'' کے مفہوم سے آشنا ہیں۔ اقلیدس کی تعلیم کے دوران ایک طالب علم لفظ مثلث کے متعلق مخصوص توضیحات سے قطع نظر کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم جان لیتے ہیں کہ جب عمومی طور پر مثلث کے متعلق کوئی مسئلہ زیر مطالعہ ہو تو ہمیں مثلث قائمۃ الزاویہ یا کسی دوسری قسم کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہئے۔ یہ درحقیقت آموزش کا وہ عمل ہے جس کے ذریعے ہم لفظ مثلث سے وہ تمام تصورات وابستہ کرنا سیکھ جاتے ہیں جو ہر قسم کی مثلث پر منطبق ہوتے ہیں۔ جب ہم یہ مرحلہ طے کر لیتے ہیں۔ تو پھر مثلث کے تصور سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ چونکہ ہم عام مفہوم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم کلیات پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔

اب تک ہم نے مفرد لفظ ہی سے بحث کی ہے اور اسی لئے صرف ایسے لفظوں کو پیش نظر رکھا ہے جن کو مفرد حالت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ بچہ جملے استعمال کرنے سے پہلے خاص قسم کے مفرد الفاظ ہی ادا کرتا ہے تاہم ان میں سے بعض مفرد الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا استعمال جملے کے پیشگی استعمال کو مستلزم ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص لفظ ولدیت اس وقت تک استعمال نہیں کرے گا جب تک اس نے پہلے سے ایک مفروضہ جملہ جان باپ ہے جیمز کا استعمال نہ کر لیا ہو۔ کوئی شخص علت کا لفظ اس وقت تک استعمال نہیں کر سکتا جب تک اس سے پہلے اس نے یہ نہ جان رکھا ہو کہ آگ مجھے گرم رکھتی ہے۔ جملے نئے مفاہیم سمجھاتے ہیں اور کرداریت کے اصولوں سے ان کی وضاحت آسان بھی نہیں۔ تاہم فلسفہ لازماً جملے کی تفہیم کا تقاضا کرتا ہے چنانچہ اس پر غور کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں پنٹاگون سے باہر کی دنیا میں بچے ابتداء مفرد لفظ سے کرتے ہیں اور جملے بعد میں سیکھتے ہیں۔ تاہم ایک سطح سے دوسری سطح تک سفر کی رفتار میں ان کے ہاں بہت تفاوت پایا جاتا ہے۔ میرے دونوں بچوں نے ایک دوسرے سے مختلف

رویے اختیار کئے۔ میرے بیٹے نے پہلے مفرد حرف' پھر مفرد لفظ اور پھر کہیں اس کے بعد سوا دو سال کی عمر میں تین چار لفظوں پر مشتمل جملوں کا استعمال سیکھا۔ لیکن میری بیٹی نے اس کے برعکس بہت جلد جملے بنانے پر قدرت حاصل کر لی۔ وہ ابھی اٹھارہ مہینوں (ڈیڑھ سال) کی تھی۔ اور بظاہر سوئی ہوئی تھی۔ جب اسے اپنے آپ سے یہ فقرہ کہتے ہوئے سنا گیا۔ ''پچھلے سال میں تیراکی کے تختے پر سے چھلانگ لگایا کرتی تھی ہاں واقعی!'' یہ ظاہر ہے کہ ''پچھلے سال'' کی ترکیب بغیر سمجھے ہوئے استعمال کی گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے پہل بچے جو جملے استعمال کرتے ہیں وہ دوسروں کی زبان سے سنے ہوئے فقروں کی من وعن تکرار ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی نیا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا جس کا لفظ کی آموزش کے سلسلے میں پہلے ذکر نہ آ چکا ہو۔ البتہ یہاں جو نئی بات حل طلب ہے وہ بچے کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ سیکھے ہوئے الفاظ کو کس طرح ایک جملے میں اس طرح مربوط کر دیتا ہے کہ اگرچہ وہ فقرہ پہلے سے سنا ہوا نہیں ہوتا' تاہم وہ بچے کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کر دیتا ہے۔ یہاں ہیئت اور ترکیب پر دسترس کا سوال در آتا ہے۔ بہرحال ہیئت اور ترکیب کے مجرد تصورات یہاں بھی صرف اسی حد تک دخل انداز ہوتے ہیں جس حد تک لفظ انسان کے استعمال میں۔ انسان کا کلی تصور۔ البتہ' مہیج کی ہیئت اور ردعمل کے درمیان ایک علی تعلق یہاں ضرور موجود ہوتا ہے۔ بچہ بہت جلد اس قسم کے جملوں سے مختلف تاثرات اخذ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ بلیاں چوہے کھاتی ہیں بمقابلہ چوہے بلیاں کھاتے ہیں اور تھوڑے ہی عرصے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے صرف ایک ہی فقرہ استعمال کرنے لگتا ہے۔ اور دوسرے کو رد کر دیتا ہے۔ اس صورتحال میں علت (یعنی سننا) اور نتیجہ (یعنی بولنا) پورے فقرے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کیونکہ یوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک صورت حال جزوی طور پر ایک لفظ کو جنم دے اور اس کا کوئی دوسرا جزو دوسرے لفظ کو۔ لیکن پورے فقرے کی تشکیل کے لئے دونوں اجزاء کا باہمی تعلق ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں جملہ موجود ہوتا ہے وہاں دو مرکب حقیقتوں کے درمیان علی رشتہ بھی جنم لیتا ہے۔ یعنی وہ حقیقت جو ظاہر کی جاتی ہے اور وہ فقرہ جو اسے ظاہر کرتا ہے۔ دونوں حقیقتیں اپنی ترکیبی صورت میں علت و معلول کے رشتے میں یوں منسلک ہوتی ہیں جسے ان کے اجزاء کے مجموعوں کے رشتوں کے حوالے سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں جب بچہ نسبتی الفاظ کا صحیح استعمال جان لیتا ہے مثلاً ''کھانا'' تو وہ ماحول کے نسبتی

احوال سے ایک معلول کے طور پر متاثر ہونے کا اہل ہو جاتا ہے۔ یہ امر پیچیدگی کی ایک نئی سطح کی نشاندہی کرتا ہے جو مفرد لفظ کے استعمال میں نہیں پائی جاتی۔

اس اعتبار سے نسبتی الفاظ کے صحیح استعمال یعنی فقرے کو ہم حقیقی معنوں میں ''ہیئت کا تصور'' قرار دے سکتے ہیں۔ یہاں' مہیج ایک ہیئت پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک مخصوص ردعمل کا تقاضا کرتا ہے۔ فرض کیجئے بچہ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر ہونا ایک حقیقت کے طور پر جان لیتا ہے۔ وہ مہیج جو لفظ ''اوپر'' استعمال کرنے کا باعث بنتا ہے ماحول کا ایک نسبتی تعلق ہے۔ اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تعلق سمجھ لیا گیا ہے کیونکہ اس نے ایک خاص ردعمل کو جنم دیا ہے۔ تاہم یہ بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ ''اوپر'' جس تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ لفظ ''اوپر'' سے مشابہت نہیں رکھتا۔ اور یہی بات عام مادی اشیاء کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ طبیعیات کی رو سے پتھر دراصل وہ نہیں ہوتا جو ہمیں نظر آتا ہے تاہم یہ کہنا درست ہوتا ہے کہ ہم نے پتھر کو دیکھا ہے۔ گویا ایک طرح کی پیش بینی' وہ خاص نکتہ جو متبادل ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ جب ایک شخص جملوں کے صحیح استعمال پر قادر ہو جاتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس نے ہیئتی یا نسبتی مہیات کو قبول کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔

فقرے کی ساخت' جو کسی نسبتی تعلق کو ظاہر کرتی ہے' مثلاً یہ چیز اس چیز کے اوپر ہے۔ یا بروٹس نے سیزر کو قتل کیا۔ اس حقیقت کی ساخت سے جسے وہ ظاہر کرتی ہے مختلف ہوتی ہے اور یہ اختلاف بہت اہم ہوتا ہے۔ مثلاً ''اوپر'' ایک نسبت ہے جو دو الفاظ ''یہ'' اور ''اس'' کے مابین پائی جاتی ہے۔ لیکن لفظ ''اوپر'' بذاتہ کوئی نسبت نہیں ہے۔ فقرے میں یہ نسبت یا تو زمانی ہوتی ہے اور اگر فقرہ لکھا ہوا ہو تو مکانی۔ تاہم یہ نسبتی لفظ بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا دوسرے الفاظ۔ لاطینی جیسی متصرف Inflected زبانوں میں لفظوں کی ترتیب' نسبت کو ظاہر کرنے کے لئے اہم نہیں ہوتی۔ لیکن غیر متصرف زبانوں میں' لفظوں کی ترتیب نسبت یا تعلق کو ظاہر کرنے کے اعتبار سے اہم ہوتی ہے۔ بروٹس نے سیزر کو قتل کیا۔ یا سیزر نے بروٹس کو قتل کیا۔ جیسے دو جملوں میں لفظوں کی ترتیب ہی ان کے فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ الفاظ مادی مظہر ہوتے ہیں جن کے مابین زمانی اور مکانی نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ ہم ان نسبتوں کو دوسری نسبتوں کے لسانی اشارے وضع کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس نسبت کو کی معنوی جہت کو واضع کرنے کے لئے کہ اس کا رجحان اسے ب کی جانب

ہے۔ یا ب سے ا کی جانب۔

فلسفے کے مختلف مکاتیب میں بہت سے الجھاؤ، محض اسی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے کہ نسبتیں باہم دوسری نسبتوں کے حوالے سے نہیں پہچانی جاتیں۔ بلکہ نسبتی لفظوں کے ذریعے جوخود بعینہ دوسرے لفظوں کی مانند ہوتے ہیں۔ چنانچہ رشتوں کے ادراک کی کوشش میں مسلسل رشتوں کے باہمی عدم اعتبار اور لفظ کے اعتبارات کے درمیان بھٹکتے رہتے ہیں۔ مثلاً اس حقیقت پر غور کیجئے کہ بجلی کی چمک گرج سے پہلے ظاہر ہوتی ہے۔ اگر ہم اسے ایک ایسی زبان میں ظاہر کرنا چاہیں جو حقیقت کی ترتیب کو بعینہ پیش کرتی ہو تو ہمیں صرف یوں کہنا چاہیئے کوندا' کڑکا یہاں مراد یہ ہو گی کہ جس طرح اول لفظ دوسرے لفظ سے پہلے واقعہ ہوا ہے اسی طرح جس حقیقت کو پہلا لفظ ظاہر کرتا ہے وہ اس حقیقت پر متقدم ہے جسے دوسرا لفظ ظاہر کرتا ہے بالفرض اگر ہم یہ طریقہ زمانی ترتیب کو ظاہر کرنے کے لئے اختیار کر لیں تو پھر ہمیں اور بھی ایسے الفاظ کی ضرورت ہو گی جو دوسری تمام نسبتوں پر حاوی ہوں۔ کیونکہ صرف الفاظ کی ترتیب سے ان کو ظاہر کرنے کی کوشش ناقابل برداشت ابہام کا باعث بنے گی۔ یہ سب باتیں اس وقت اپنی اہمیت کو واضح کر دیتی ہیں جب ہم دنیا کی ساخت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کیونکہ صرف اور صرف زبان کا پیشگی مطالعہ ہی ہمیں مابعد الطبیعاتی غوروفکر میں اس گمراہی سے بچا سکتا ہے۔ جسے زبان جنم دیتی ہے۔

اس مطالعہ کے دوران میں نے لفظ کے بیانیہ اور تخئیلی استعمال کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ یہاں میرے پیش نظر لفظ کے مفہوم سے قریبی علاقہ رکھنے والا فوری حسی مہیج تھا۔ الفاظ کے دوسرے طریقہ ہائے استعمال سے بحث کرنا اس وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک ہم حافظے اور تخیل کا مطالعہ نہ کر لیں۔ سردست میں نے بحث کو کرداری نفسیات کے نکتہ نظر سے ان تاثرات کے مطالعہ تک محدود رکھا ہے جن کا تعلق بطور ایک مہیج سننے سے ہے۔ یا ان وجوہات سے جو لفظ کے استعمال پر منتج ہوتی ہیں۔ یعنی جب لفظ کا تعلق کسی ایسی چیز سے ہوتا ہے جو حسی طور پر موجود ہوتی ہے۔ یہاں اتنا کہہ دینا ہی کافی ہو گا کہ لفظوں کو دوسرے طریقوں سے استعمال کرنا۔ مثلاً بیانیہ یا تخئیلی بھی قانون ائتلاف کے نئے اطلاقات کا شاخسانہ ہے۔ سردست ہم اس موضوع کو نہیں چھیڑ سکتے۔ تا آنکہ بعض دوسرے نفسیاتی مسائل کو طے نہ کر لیا جائے۔

---

(1) اب تو بات ریڈیو سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔ ویڈیو کیسٹ، مائیکروفلم اور سب سے بڑھ کر کمپیوٹر نے تو پورا منظر نامہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ (مترجم)

(2) ''رابن سن کروسو'' نام کے ناول کا ایک کردار۔ اس میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو ایک ویران جزیرے میں تنہا دن گزار رہا ہے۔

انسانی اقدار میں جنس کا مقام

جنس کے موضوع پر لکھنے والوں کو ہمیشہ اس الزام کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس موضوع میں غیر معمولی (یا مریضانہ) شغف کا شکار ہیں۔ یہ الزام ان لوگوں کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے موضوعات کو نہ ہی چھیڑا جائے تو بہتر ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایک معمولی نوعیت کے موضوع کی خاطر اخلاق کے اجارہ داروں کی جبر وتوبیخ کا خطرہ مول لینا مصنف کے غیر معمولی انہاک کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بالعموم اس کا نشانہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو روایتی اخلاق میں تبدیلی کی حمایت کرتے ہیں۔ بظاہر تو یہ لوگ پیشہ ورطوائفوں کے خلاف لوگوں کے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ اس مذموم مقصد کے لئے عورتوں کے اغواء اور بیرون ملک فروخت کے خلاف قوانین نافذ کرواتے ہیں لیکن دراصل ان کا مقصد رضا کارانہ اور شادی کے بغیر عورت مرد کا میل ملاپ ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خواتین کو اونچے سکرٹ پہننے اور لپ سٹک کے استعمال پر مطعون کرتے ہیں۔ یا ساحل سمندر پر اس تاک جھانک میں لگے رہتے ہیں کہ کہیں نہانے کا غیر مناسب مختصر لباس نظر آ جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہیں کوئی جنسی خبط کا شکار قرار نہیں دیتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی آزادی کے حامیوں کے مقابلے میں ان پر جنس کا بھوت زیادہ سوار ہوتا ہے ۔سخت گیر اخلاقی نظام بالعموم ہوس زدہ جذبات کے خلاف ردعمل ہوتا ہے اور جو شخص اس (نظام) پر اصرار کرتا ہے دراصل اس کا اپنا ذہن ناشائستہ خیالات کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ یہ خیالات اس وجہ سے ناشائستہ نہیں ہوتے کہ ان میں جنس کا ذکر ہوتا ہے بلکہ اس کی اصل وجہ

یہ ہوتی ہے کہ نام نہاد اخلاقیات نے ان لوگوں کو صاف ستھری ذہنیت سے محروم کر دیا ہوتا ہے۔ میں اس حد تک اہل کلیسا سے متفق ہوں کہ جنسی موضوعات میں انہماک صریحاً برائی ہے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ سینٹ انتھونی دنیا کے بدترین ہوس پرستوں کے مقابلے میں زیادہ جنس زدہ تھا (ماضی قریب سے مثالیں دے کر میں لوگوں کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتا) خوردونوش کی طرح جنس بھی ایک فطری تقاضا ہے۔ ہم چٹوروں اور بلانوشوں کو اس لئے قابل مذمت سمجھتے ہیں کہ ایک ایسی ضرورت جسے زندگی میں ایک جائز مقام حاصل ہے ان کے دل و دماغ پر بُری طرح چھا گئی ہے۔ تاہم کسی شخص کو اس کی صحت مندانہ اور جائز حد تک خوش خوراکی کے لئے مورد الزام نہیں سمجھتے۔ تارک الدنیا لوگ بیشک اسے روا نہیں رکھتے۔ ان کی رائے میں ہر شخص کو اپنی خوراک اس قلیل ترین مقدار تک محدود کر دینی چاہئے۔ جو جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو۔ قوت لایموت' لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس رائے کو قبول عام حاصل نہیں ہو سکا اور اسی بناء پر اسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ پیوریٹن مسلک کے پیروکار جنسی لذت اندوزی سے بچنے کے لئے اپنی تمام تر توجہ دسترخوان کی لذت پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ سترھویں صدی میں ان کے ایک مخالف کو ان پر چوٹ کرنے کے لئے یہ نکتہ سوجھا کہ ''اگر تم رنگین راتوں اور لذیذ کھانوں کے رسیا ہو تو تمہیں رہائش زاہدوں کے ساتھ اور راتیں گنہگاروں کے ہاں بسر کرنا چاہئیں۔

چنانچہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ پیوریٹن انسانی فطرت کے خالصتاً جسمانی پہلو پر قابو نہ پا سکے کیونکہ انہوں نے جو کچھ جنس سے چھینا اسے پرخوری کی نذر کر دیا۔ بسیار خوری کیتھولک مسلک کی رو سے سات مہلک گناہوں میں شامل ہے۔ اسی لئے دانتے نے بسیار خوروں کو دوزخ کے ایک عمیق تر قعر میں مقید دکھایا تھا لیکن یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کی واضح حد بندی ممکن نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کھانے پینے کے معاملے میں جائز حد کہاں ختم ہوتی ہے اور کہاں سے گناہ کی عملداری شروع ہوتی ہے جو چیزیں نشوونما کے لئے ازبس ضروری یا مددگار نہیں ان کا استعمال حرام ٹھہرے تو پھر نمکین بادام کے ہر دانے کے ساتھ ہم گناہ کی دلدل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ ان آراء کا اب چلن باقی نہیں رہا۔ بسیار خور پر نظر پڑتے ہی ہم اسے پہچان لیتے ہیں۔ کسی حد تک اسے ناپسند بھی کرتے ہیں لیکن اسے قابل تعزیر نہیں سمجھتے اور یہ بات بھی ہے کہ خوردونوش کا لالچ ان لوگوں میں عام

نہیں جنہیں کبھی جبری بھوک سے پالا نہ پڑا ہو۔ ایک دفعہ کھانے سے فارغ ہو کر دوسرے کھانے کے وقت تک لوگ عام طور پر کاروبار زیست میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ ان کے برعکس وہ لوگ جو تیاگ کے مسئلے پر ایمان رکھتے ہیں اور یوں خوراک کی قلیل ترین مقدار سے آگے نہیں بڑھتے وہ ہمہ وقت ضیافتوں کے تصورات میں الجھے رہتے ہیں۔ ان کے خوابوں میں ایسے آسیب ظہور کرتے ہیں جو رسیلے پھلوں سے لدے پھندے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو کسی مہم کے دوران منطقہ باردہ میں پھنس گئے ہوں اور وہیل مچھلی کی چربی پر گزارہ کرتے رہے ہوں وہ اپنے دن کا اکثر حصہ ان خیالوں میں گزار دیتے ہیں کہ وطن پہنچ کر وہ کسی بڑے ہوٹل میں مزے مزے کی دعوتیں اڑائیں گے۔

ان امور کے پیش نظر جنس کو خبط کے درجے تک پہنچنے سے روکنے کے لئے جو تدبیر ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ معلمین اخلاق جنس کے متعلق بھی وہی رویہ اختیار کریں جسے پرانے زمانے کے تارک الدنیا لوگوں کے برعکس اب انہوں نے خوراک کے متعلق اپنایا ہے۔ جنس، خوراک ہی کی طرح انسان کی فطری حاجت ہے۔ اگرچہ اس کے بغیر بھی انسان رہ سکتا ہے حالانکہ خوراک کے بغیر زندگی امر محال پھر بھی نفسیاتی اعتبار سے جنسی خواہش، کھانے کی خواہش کے عین مترادف ہے ترک یا پرہیز سے اس کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ آسودگی سے وقتی طور پر ماند پڑ جاتی ہے۔ ہیجانی حالت میں یہ دنیا کی ہر دوسری چیز کا نقش ذہن سے محو کر دیتی ہے۔ دوسری تمام دلچسپیاں اس کے مقابلے میں ماند پڑ جاتی ہیں۔ اس حالت میں انسان سے ایسے افعال سرزد ہو سکتے ہیں جو بعد میں اسے خود بھی غیر معقول نظر آنے لگتے ہیں۔ علاوہ ازیں کھانے پینے کی طرح پابندی یا جبر سے اس کی تحریک بھی زور پکڑ جاتی ہے۔ میں کئی ایسے بچوں کو جانتا ہوں جو ناشتے کے وقت تو سیب کھانے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے سیب چرانے کے لئے باغیچے کی طرف لپکتے ہیں۔ بیشک کھانے کی میز پر جو سیب پیش کئے گئے ہوں وہ گدرائے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں اور چوری کے سیب کچے، اس امر میں انکار کی گنجائش نہیں کہ آسودہ حال امریکیوں میں شراب نوشی کی لت آج سے بیس سال پہلے کی نسبت زیادہ عام ہے۔ اسی طرح عیسائیت کی تعلیم اور جبر نے جنس میں دلچسپی کو غیر معمولی حد تک بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ جو نسل پہلے پہل اس روایتی تعلیم سے انکار کرتی ہے وہ لازماً جنسی معمولات میں اس درجہ

غلو سے کام لیتی ہے جس کا شائبہ بھی ان لوگوں کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ جن کا رویہ منفی یا مثبت جنسی توہمات سے پاک ہوتا ہے۔ صرف آزادی ہی جنس میں غیر معمولی شغف کو ختم کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کے عادی ہو جائیں اور جنسی امور کے متعلق معقول تعلیم و تربیت کا انتظام بھی ہو۔ یہاں میں ایک دفعہ پھر اس امر کی پرزور تائید اور تاکید کرنا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک اس موضوع سے ایک ناروا حد تک دلچسپی فی نفسہٖ ایک شر ہے اور یہ کہ فی زمانہ یہ شر بہت عام ہو چکا ہے بالخصوص امریکہ میں سخت گیر اخلاقی معلمین کے ہاں اس کا بہت چرچا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اس زعم میں فریق مخالف کے متعلق ہر جھوٹی بات کو بھی فی الفور قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پیٹو۔ نفس پرست اور راہب سبھی خود گزینی کے خوگر ہوتے ہیں ان کے ذہنی افق اپنی خواہشات کے باعث آسودگی اور محرومی دونوں حالتوں میں سکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ شخص جو صحت مند جسم اور ذہن کا مالک ہو۔ وہ اپنی دلچسپیوں کو اپنی ذاتِ کی حد تک محدود نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے اردگرد نظر دوڑاتا ہے اور ایسے مقصود ڈھونڈ نکالتا ہے جو فی الحقیقت اس کی توجہ کے اہل ہوں۔ خود گزینی جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے ان لوگوں کی فطرت میں شامل نہیں ہوتی جو مائل بہ اصلاح ہوں۔ یہ مرض تو فطری جذبات کو دبانے سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ ہوس پرست شخص جو ہر وقت جنسی آسودگی کے خیالات میں ڈوبا رہتا ہے دراصل کسی نہ کسی محرومی کا شکار ہوتا ہے۔ بالکل اس شخص کی طرح جو بائیں سبب خوراک ذخیرہ کرنے کی فکر میں کھویا رہتا ہے کہ کسی وقت اسے قحط یا فاقہ کشی سے پالا پڑا تھا۔ صحت مند اور بیروں بیں مرد اور عورتیں فطری خواہشات پر پابندی سے نہیں بلکہ خوش باش زندگی گزارنے کے لئے جذبات و خواہشات کی متوازن نشو ونما سے وجود میں آتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ جنس کے معاملہ میں ضابطہ اخلاق اور ضبط نفس کی حد بھی وہی ہونی چاہئے جسے ہم خوراک کے سلسلے میں روا رکھتے ہیں۔ یعنی شائستگی اور صحت کے حوالوں سے سہہ گونہ پابندیاں، جن کی رو سے خوراک کی چوری، کسی اجتماعی دعوت میں اپنے حصے سے زیادہ کا لالچ اور خوراک کا استعمال جو صحت کے لئے مضر ہو ناروا قرار پاتے ہیں۔ اس طرح کی حد بندی جنس کے معاملے میں بھی ضروری ہے لیکن یہاں اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ حد بندی زیادہ پیچیدہ اور کہیں زیادہ ضبط نفس کی متقاضی ہوگی۔ ازروئے قانون جس

طرح کسی دوسرے شخص کی املاک میں بے جا تصرف' چوری کی ذیل میں آتا ہے اسی طرح جنسی تعلقات میں جبر یا نکاح کی حرمت کو مجروح کرنا قابل تعزیر ہے۔ صحت کا مسئلہ جنسی بیماریوں سے مربوط ہے اور یوں اس کا سلسلہ جسم فروشی سے جا ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیشہ ورانہ عصمت فروشی کا انسداد ہی اس کا حل ہے۔ یہ مقصد نوجوانوں میں آزادانہ میل ملاپ کی اجازت سے حاصل ہوسکتا ہے گزشتہ کئی سالوں سے یہ رجحان فروغ پذیر بھی ہے۔

ایک جامع جنسی ضابطہ اخلاق جنس کو نہ صرف فطری احتیاج قرار دینے پر اکتفا کرسکتا ہے اور نہ ہی اسے صرف خطرے کا ممکنہ منبع قرار دینے تک محدود رہ سکتا ہے اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جنس کا تعلق انسانی زندگی کے بعض بہترین شعبوں سے بھی استوار ہے۔ ان میں سے تین جو زیادہ اہم ہیں۔ وہ عشق و محبت' خوشگوار ازدواج اور فن ہیں' عشق اور ازدواج بالکل سامنے کی بات ہیں۔ رہا فن تو کچھ لوگ یقیناً اس خیال کے موئد ہیں کہ اس کا جنس سے کوئی تعلق نہیں۔ تاہم اب اس نظریئے کے حامیوں کی تعداد پہلے کی نسبت بہت کم رہ گئی ہے۔ یہ بات بہت حد تک واضح ہو چکی ہے کہ ہر قسم کی جمالیاتی تخلیق کا نفسیاتی تعلق نازونیاز کی روایت سے مستحکم ہے۔ یہ تعلق براہ راست یا کھلم کھلا نوعیت کا حامل نہ سہی تاہم اس کی جڑیں انسانی سرشت میں بہت گہری ہوتی ہیں۔ جنسی جذبے کو فنی اظہار میں ڈھالنے کے لئے بعض شرائط ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً فنی صلاحیت' لیکن یہ صلاحیت ایک ہی قوم میں کبھی تو بہت فروزاں ہوتی ہے اور کبھی نسبتاً محدود جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ داخلی صلاحیت کے بالمقابل ماحول بھی فنی استعداد کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آزاد فضا فنکار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ لیکن اس حوصلہ افزائی کا مطلب یہ نہیں کہ فنکار کو انعام واکرام سے نوازا جائے۔ اس سے مراد ایک ایسی آزادی اظہار ہے جو جبر یا ترغیب سے مبرا ہو تا کہ فنکار ایسا رویہ اختیار کرنے پر مجبور نہ ہو جائے جو بالآخر فن کے لئے مہلک ثابت ہو۔ جولیس پنجم نے جب مائیکل اینجلو کو قید کیا تھا تو وہ اس آزادی میں مخل نہیں ہوا تھا جس کی فنکار کو ضرورت ہوتی ہے۔ دراصل اس نے اسے اس وجہ سے محبوس کیا تھا کہ وہ اسے ایک اہم شخصیت سمجھتا تھا اور کلیسا کے سربراہ سے کمتر کسی شخص کی اہمیت کو برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اس سے اس کی توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ تاہم جب فنکار کو آبائے شہر اور امراء کا کاسہ لیس بننے پر مجبور کر دیا جائے اور اسے

اپنی تخلیقات ان لوگوں کے جمالیاتی ذوق کی پیروی یا تسکین کے لئے وقف کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس کی فنی آزادی چھن جاتی ہے اور اگر وہ سماجی یا اقتصادی تادیب کے خوف سے ایک ایسے ازدواجی بندھن کو برقرار رکھنے پر مجبور ہو جو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو چکا ہو تو وہ فنی تخلیق کے لئے مطلوبہ توانائی سے محروم ہو جاتا ہے، ایسے معاشرے جو رسم و رواج کی حد تک پارسائی کے دعویدار ہوں ان میں کبھی عظیم فن تخلیق نہیں ہوتا۔ عظیم فن ان معاشروں میں تخلیق ہوتا ہے جو ایسے افراد پر مشتمل ہوتے ہیں جن کی نسل ادا ہو(Idahu) نے منقطع کروا دی تھی۔ (جہاں ادا ہو(Idahu) جیسے لوگ موجود ہوں وہ معاشرے بانجھ ہو جاتے ہیں) سر دست امریکہ فنی مہارت کے لئے یورپ کا محتاج ہے جہاں ابھی تک گھسی پٹی آزادی موجود ہے۔ لیکن اب یورپ میں بھی امریکی اثرات غلبہ حاصل کر رہے ہیں تو پھر ہمیں مجبوراً استمداد کے لئے حبشیوں سے رجوع کرنا پڑے گا۔ یوں نظر آ رہا ہے کہ فن کی آخری پناہ گاہ تبت کی سطح مرتفع نہیں تو کہیں بالائی کانگو میں واقع ہو گی۔ تاہم اس کا خاتمہ زیادہ دور کی بات نہیں کیونکہ امریکہ انعام و اکرام کی جو بارشیں غیر ملکی فنکاروں پر کر رہا ہے وہ بالآخر ان کی فنکارانہ موت پر منتج ہوں گی۔ ماضی میں فن کو پسند عام کی سند حاصل تھی اس پسند کا مدار زندگی کی سرخوشی پر تھا اور یہ سرخوشی جنسی بے تکلفی کی مرہون تھی۔ اس سرخوشی کا سرچشمہ بے روک ٹوک جنسی اظہار تھا جہاں جنس پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں وہاں زندگی صرف کام کے لئے وقف ہو کر رہ جاتی ہے اور کام کی خاطر کام کا صحیفہ کسی قابل ذکر کارگزاری کا ضامن نہیں بنتا۔ مجھے اس قسم کے اعداد و شمار سے غرض نہیں کہ امریکہ میں ہر روز یا ہر لحہ کتنے لوگ جنسی وظیفہ ادا کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے غرض ہے کہ دوسرے ممالک سے ان اعداد و شمار کی نسبت کیا ہے۔ مجھے ان کی صحت سے انکار کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ روایتی معلمین اخلاق جس خطرناک ترین غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ یہ ہے کہ جنسی اظہار کو جنسی وظیفے تک محدود کر دیتے ہین۔ یوں انہیں اسے ہدف ملامت بنانے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ مجھے کسی ایسے مہذب یا وحشی شخص کا علم نہیں جس کی جنسی جبلت صرف جسمانی تعلق سے مطمئن ہو جاتی ہو۔ جنسی وظیفہ کا تقاضا کرنے والی جبلت کی آسودگی کے لئے نازو نیاز، محبت اور باہمی ہم آہنگی اور دوستی ضروری ہیں۔ ان کے بغیر جسمانی تقاضا وقتی طور پر تو مطمئن ہو جاتا ہے لیکن ذہنی بھوک برقرار رہتی ہے مکمل طمانیت

نصیب نہیں ہوتی۔ فنکار کے لئے جس نوعیت کی جنسی آزادی کی ضرورت ہوتی ہے اس کا مطلب ہے محبت کرنے کی آزادی۔ بہیمانہ جسمانی ضرورت کو کسی اجنبی عورت سے پورا کر لینا اس کا مقصود نہیں ہوتا اور مشکل یہ ہے کہ روایتی اخلاق کے معلمین محبت کی آزادی کا حق واگزار کرنے پر کسی طور رضامند نہیں ہوتے۔ دنیا کے امریکی رنگ میں ڈھل جانے کے بعد فن کے زندہ رہنے کی صرف یہ صورت ہے کہ امریکہ اپنا رویہ بدل لے۔ معلمین اخلاق اپنے اندر لچک پیدا کریں اور جو گم کردہ راہ ہیں وہ اپنی اصلاح کی فکر کریں۔ مختصر یہ کہ ان دونوں طبقات کو جنس کے معاملے میں برتر اقدار کی اہمیت کا احساس ہونا چاہئے اور ان کا ہاں اس امکان کا شعور پیدا ہو کہ زندگی میں خوشی' بنک میں جمع شدہ پونجی سے زیادہ قدر و قیمت کی حامل ہے۔ سیاحوں کے لئے امریکہ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ امر خوشی کا فقدان ہے۔ خوش وقتی سے مراد وہاں یا تو پاگل پن ہے یا اوباشی' اظہار ذات کی بہجت کے برعکس ایک لمحے کی خودفراموشی۔ وہ لوگ جن کے آباء بلقان میں یا پولینڈ کے دیہات میں باجے کی دھنوں پر رقص کیا کرتے تھے اب سارا سارا دن اپنی میزوں سے چمٹے رہتے ہیں۔ ان کے چاروں طرف ٹائپ رائٹر ہوتے ہیں یا ٹیلیفون۔ سنجیدہ' خودبین اور بے مصرف، شام کے وقت وہ یہاں سے نکلتے ہیں تو شراب نوشی اور ایک دوسری قسم کے شوروشغف میں خوشی کو تلاش کرتے ہیں۔ لیکن دراصل مجنونانہ اور جزوی خودفراموشی کے علاوہ کچھ نہیں پا سکتے۔ یہاں بھی وہی روپے کے کاروبار کا فضول چکر چلتا ہے۔

میرا مقصود یہ نہیں ہے اور نہ ہی میں اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ انسانی زندگی میں جنس ہی سب کچھ ہے۔ سائنس نظریاتی ہو یا عملی میرے نزدیک اس کا جنس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہی صورتحال بعض اہم سماجی اور سیاسی سرگرمیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ بالغ زندگی کے الجھے ہوئے معاملات جن جبلتوں کی ذیل میں آتے ہیں ان کا تعین (تقسیم) بہت سادہ ہے۔ یعنی قوت کا حصول' جنس' اور اولاد کی خواہش مفادات کے لئے جو مختلف اعمال ضروری ہیں ان کے علاوہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کے محرکات انہیں تین جبلتوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان تین میں حصول قوت کا جذبہ از اول تا آخر سرگرم کار رہتا ہے۔ بچہ میں چونکہ ابتداً یہ صلاحیت کم ہوتی ہے اس لئے وہ مسلسل زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اس کی بہت سی سرگرمیاں اسی سوتے سے پھوٹتی ہیں۔ اناء اس کے ہاں دوسرا

غالب جذبہ ہے یعنی توصیف کی خواہش اور ہدف ملامت بننے یا نظرانداز کئے جانے کا خوف۔ اس کا سماجی وجود اسی کا مرہون ہوتا ہے۔ اسی سے وہ صفات جنم لیتی ہیں جو سماجی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ جنس سے اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگرچہ نظریاتی اعتبار سے یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں تاہم جہاں تک حصول قوت کا تعلق ہے میری دانست میں جنس کے ساتھ اس کا تعلق بہت کم ہے۔ چنانچہ قوت کا حصول بھی کم و بیش اناء ہی کی طرح بچے کو پڑھائی اور جسمانی ورزش کی مشقت برداشت کرنے پر مائل کرتا ہے۔ جستجو اور علم کے حصول کو میرے خیال میں قوت کی چاہ کی ایک شاخ تصور کرنا چاہئے۔ اگر علم ہی قوت ہے تو پھر علم کی جستجو قوت ہی کی جستجو ہے۔ چنانچہ سائنس، حیاتیات اور عضویات کے کچھ شعبوں کو چھوڑ کر جنسی جذبے کے دائرہ اثر میں نہیں آتی۔ آج شہنشاہ فریڈرک ثانی موجود نہیں اس لئے یہ رائے مفروضہ کی سطح پر ہی رہتی ہے۔ وہ ہوتا تو شاید یہ تجربہ کر گزرتا کہ آختگی کے بعد ایک ماہر ریاضی دان اور موسیقار کی کارکردگی کس طرح متاثر ہوتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ریاضی دان کے معاملے میں تو کچھ فرق نہ پڑتا۔ البتہ موسیقار بری طرح متاثر ہوتا اور یہ جانتے ہوئے کہ علم کی جستجو انسانی سرشت میں ایک اہم بنیادی عنصر ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی اعمال کا ایک معتدبہ حصہ جنس کے غلبے سے پاک ہے۔

حصول قوت کا جذبہ اپنے وسیع معنوں میں بیشتر سیاسی اعمال کے لئے محرک کا کام دیتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ برے سیاستدان عوامی بہبود سے کچھ سروکار نہیں رکھتے بلکہ اس کے برعکس میں تو یہ کہوں گا کہ سیاستدان وہ شخص ہے جس میں پدری شفقت اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ تاہم حصول قوت سے یکسر بے نیازی کی صورت میں وہ اس مشقت کو جھیلنے پر آمادہ نہ ہوگا جو سیاسی منصوبوں کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو عوامی بہبود کے شعبوں سے وابستہ تھے تاہم ذاتی جاہ پسندی کے بغیر انہیں اتنی استعداد میسر نہ آتی کہ وہ اس کار خیر کو سرانجام دے سکتے جو ان کا مطمح نظر تھا۔ ایک خاص فیصلہ کن موقعہ پر ابراہام لنکن نے اپنے دو ناراض سینیٹروں سے گفتگو شروع ہی اس جملہ سے کی تھی۔ اور ختم بھی اسی پر ''میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر ہوں۔ جسے بہت وسیع اختیارات حاصل ہیں'' اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس حقیقت کے اظہار میں اس کے لئے ایک گونہ مسرت کا شائبہ بھی موجود تھا سیاست کے سارے کھیل میں خواہ وہ شر کے

لئے ہو یا خیر کے لئے دو محرکات بہت قوی ہوتے ہیں ایک کا تعلق اقتصادیات سے ہے اور دوسرے کا قوت کی تمنا سے۔ فرائڈ کے نظریات کے مطابق سیاست کی تشریح مجھے تو صریحاً غلط نظر آتی ہے۔

جو کچھ اب تک ہم نے کہا ہے وہ اگر درست ہے تو فنکاروں کے علاوہ دوسرے عظیم لوگ جو کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں ان میں جنسی محرکات کو دخل نہیں ہوتا۔ اگر اس نوعیت کی اہم کارروائیوں کا جاری رہنا ناگزیر ہے۔ اور ایک کم تر ہی سطح پر سہی ان کا عموم بھی ضروری ہے تو پھر انسانی سرشت میں ودیعت جذباتی جوش اور ولولہ کو جنس زدہ نہیں ہونا چاہئے۔ کاروبار حیات کا فہم وشعور اور اس میں اصلاح کی تمنا۔ ترقی و بہبود کے دو بڑے سرچشمے ہیں۔ ان کے بغیر انسانی سماج یا تو ایک مقام پر رک جائے گا یا زوال پذیر ہو جائے گا حد سے بڑھی ہوئی طمانیت علم اور بہبود کے لئے جذبوں کو افسردہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ کابڈن نے جان برائٹ کو آزادانہ تجارت کی مہم میں شمولیت پر آمادہ کرنے کے لئے اس کی بیوی کی وفات سے پیدا ہونے والے صدمہ کا واسطہ دیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس ذاتی صدمے کی عدم موجودگی میں برائٹ دوسروں کے دکھ درد بانٹنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ بہت سے لوگ عملی دنیا میں ناکامی سے بددل ہو کر تجریدی سرگرمیوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ گویا ایک صاحب عزیمت کے لئے دکھ ایک اہم محرک ثابت ہوسکتا ہے۔ مجھے اس امر سے بھی انکار نہیں کہ کلی طمانیت ہمیں مزید بہجت و سرخوشی کے لئے تگ دو سے مانع آتی ہے۔ تاہم مجھے اس امر سے اتفاق نہیں (صرف اس امکان کے پیش نظر کہ شاید اس میں کوئی بہتری کی صورت نکل آئے) کہ دوسروں کو دکھ پہنچانا۔ انسانی فرائض میں شامل ہے۔ ننانوے فیصد معاملات میں غم تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ باقی ایک فیصد کے لئے وہ ناگزیر فطری دکھ ہی بہت ہے جو اس گوشت پوست کے انسان کا مقدر ہے۔ جب تک موت موجود ہے غم بھی باقی رہے گا۔ اس میں اضافہ کسی صورت بھی انسانی فرائض میں شامل نہیں۔ اگرچہ یہ بات بھی درست ہے کہ کچھ یگانہ صفت لوگ اس کی قلب ماہیت کا گر جانتے ہیں۔

☆☆☆

مسرت کا تصور...........مشرق ومغرب میں

جی ایچ ویلز(Wells) کی ''ٹائم مشین'' سے ہم سب آشنا ہیں۔ یہ جس کے تسلط میں آ جائے وہ اس کے ذریعے وقت میں پیچھے کی طرف (ماضی میں) یا آگے کی طرف (مستقبل میں) سفر کرنے پر قادر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس طرح خودمشاہدہ کرسکتا ہے کہ ماضی کیسا تھا۔ اور مستقبل میں صورت حال کیا ہوگی۔ تاہم یہ بات ہم لوگ ہمیشہ نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ''ویلز'' کی ایجاد سے جومفروضہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ان میں سے بیشتر فی زمانہ دنیا کے مختلف حصوں میں سفر کرنے سے باآسانی میسرآ جاتے ہیں۔ ایک یورپی باشندہ جب نیویارک یا شکاگو میں پہنچتا ہے تو گویا وہ اس مستقبل کو دیکھ لیتا ہے جس تک یورپ کی رسائی کا امکان موجود ہے۔ بشرطیکہ وہ اقتصادی بحران سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر وہ ایشیا کا رخ کرتا ہے تو گویا وہ ماضی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں ہندوستان میں اسے قرون وسطیٰ کا منظر نظر آئے گا۔ تو چین پہنچ کر اٹھارہویں صدی کا منظر نامہ اس کے سامنے ہوگا۔ اگر جارج واشنگٹن کے لئے اس دنیا میں واپس آنا ممکن ہوتو اس ملک کو دیکھ کر جس کی بنیاد اس نے خود رکھی تھی' حیران و پریشان رہ جائے۔ انگلستان میں شاید وہ اتنی اجنبیت محسوس نہ کرے اور فرانس میں تو اجنبیت کا احساس اور بھی کم ہوگا۔لیکن مکمل اپنائیت وہ تب کہیں جا کرمحسوس کرے گا جب اس کے قدم سرزمین چین کو چھوئیں گے۔ اپنے اس روحانی سفر یا آوارہ گردی میں پہلی دفعہ اس کا سامنا ایسے لوگوں سے ہوگا جواب بھی ''زندگی، آزادی اور سرخوشی'' کے جویا ہیں۔ ان امور کے متعلق اہل چین کے تصورات اب بھی کم وبیش وہی ہیں جو جنگ آزادی کے دوران امریکیوں کے دل و

دماغ میں جاں گزیں تھے۔ اسی صورت حال کے پیش نظر' جمہوریہ چین کی سربراہی اس کے لئے زیادہ دور کی بات نہیں ہوگی۔

مغربی تہذیب کا دائرہ اثر شمالی اور جنوبی امریکہ' یورپ (ماسوائے روس) اور برطانوی خودمختار مقبوضات تک پھیلا ہوا ہے اور اس تہذیب کی قافلہ سالاری کا منصب اس وقت امریکہ کو حاصل ہے۔ وہ تمام امتیازات جو مشرق کو مغرب سے جدا کرتے ہیں ان کی سب سے زیادہ نمایاں اور ترقی یافتہ صورت امریکہ میں نظر آتی ہے۔ ہم ترقی کے اس تصور کو کچھ اس طرح قبول کرنے کے عادی ہو چکے ہیں کہ اب ہم بلا رد وقدح یہ مان لیتے ہیں کہ گزشتہ صدی کے دوران جو انقلابات یا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہ سب انسانی بہبود کے لئے تھیں۔ اور یہ کہ اسی طور بہتری کے اور بھی بہت سے امکانات آئندہ وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔ البتہ براعظم یورپ میں جنگ اور اس کے نتائج نے ان توقعات کو اس بری طرح مجروح کیا ہے کہ اب لوگ ماضی یعنی 1914ء سے پہلے کے زمانے کو "سنہری دور" کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں جس کے لوٹ آنے کا امکان آئندہ کئی صدیوں تک مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ اور بات ہے کہ انگلستان میں رجائیت پسندی کی روبہ وارکسی حد تک سہہ گئی ہے۔ اور امریکہ میں تو یہ تاثرات اور بھی مبہم رہے ہیں۔ ہم میں سے ان لوگوں کے لئے چین کی سیاحت یقیناً دلچسپی کی حامل ہوگی جو ترقی کو ایک مسلمہ امر گردانتے ہیں۔ کیونکہ چین تو آج بھی اسی مقام پر کھڑا ہے جسے ہم ڈیڑھ سو برس پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جو تبدیلیاں ہمارے ہاں واقع ہوئی ہیں کیا مجموعی طور پر ان سے کوئی حقیقی بہتری یا بہبود وجود میں آئی ہے۔

یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ چینی تہذیب کی اساس' کنفیوشس کی تعلیمات پر ہے جس کا ظہور پانچ سو سال قبل مسیح میں ہوا تھا۔ یونان اور روما کے مفکرین کے برعکس وہ اس بات کا مویئد نہ تھا کہ انسانی معاشرہ فطری طور پر ترقی پذیر ہے۔ بلکہ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ ماضی بعید میں سب حکمران دانشور تھے اور لوگ اس حد تک خورسند کہ آج اس گئے گزرے دور میں اس کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن اس کو واپس لانا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ اسے غلط فہمی کہئے یا خوش فہمی۔ تاہم یہ بات ظاہر ہے کہ کنفیوشس عملی طور پر ازمنہ قدیم کے دوسرے معلمین کی طرح ایک پائیدار معاشرہ قائم کرنے کا خواہاں تھا۔ ایک ایسا قسم کا معاشرہ جس

میں شرف انسانی کا ایک خاص معیار تو بہرحال برقرار رہتا ہے لیکن برتر معاملات کے حصول کے لئے ہمہ وقت سرگرمی مفقود ہوتی ہے۔ اس حد تک وہ ایک کامیاب ترین انسان تھا کہ اس کی شخصیت کی چھاپ' چینی تہذیب پر اس کے عہد حیات سے لے کر آج تک بدستور موجود ہے۔ اس کے عہد میں چینی' آج کل کے چین کے مقابلے میں ایک بہت کم تر خطہ زمین پر برسرتسلط تھے۔ اس وقت چین متعدد باہم برسرپیکار ریاستوں میں منقسم تھا۔ تاہم تین سو سال بعد وہ اس سارے علاقے پر اپنا تسلط جما چکے تھے جسے آج کل چین کہا جاتا ہے۔ اور انہوں نے ایک ایسی سلطنت کی داغ بیل ڈال دی تھی جو آج سے پچاس سال پہلے کی ہر سلطنت سے رقبے اور آبادی میں بڑی تھی۔ بیرونی دہشت گردی' منگول اور مانچو قبائل کی یورشیں' گاہ گاہ کی مختصر یا طویل یورشوں اور خانہ جنگی کے باوجود کنفیوشس کا قائم کردہ نظام برقرار رہا۔ اس کے جلو میں فنون' ادب اور ایک مہذب طریق زندگی کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ تو کہیں اب آ کے ہمارے عہد میں' مغرب اور مغرب زدہ جاپانی اثر ونفوذ کے باعث اس نظام میں شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہوئے ہیں۔

چنانچہ ظاہر ہے کہ ایک ایسا نظام جو غیر معمولی حد تک پائیداری کا حامل ہو' لازماً اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتا ہوگا۔ اور اس اعتبار سے یقیناً احترام اور توجہ کا مستحق ہے۔ مروجہ معنوں میں ہم اس نظام کو مذہب کا نام نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس میں کسی ماورائی جہت یا متصوفانہ تصورات کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ تو صرف ایک اخلاقی نظام تھا۔ تاہم اس کی اخلاقیات میں عیسائیت کی طرح وہ غلو نہیں پایا جاتا تھا جو اسے عام آدمی کے لئے ناقابل عمل بنا ڈالتا۔ اصلاً کنفیوشس کی تعلیمات ہمارے ہاں کے اس پرانے آورش سے مماثلت رکھتی ہیں جو طبقہ اشراف سے اٹھارویں صدی میں منسوب کیا جاتا تھا۔ اس کا ایک قول اس امر کی وضاحت کرتا ہے (میں نے یہ حوالہ لائیونل گائلز کے مرتبہ اقوال کنفیوشس سے لیا ہے):

> "حقیقی معنوں میں شریف انسان وہ ہوتا ہے جو محاذ آرائی سے ہمیشہ گریز کرے اگر کہیں مسابقت ناگزیر ہے تو وہ صرف نشانہ بازی کے مقابلے میں۔ لیکن یہاں بھی مقابلے سے پہلے وہ اپنے حریف کو انکسار کے ساتھ سلام پیش کرتا ہے اور بعد میں بھی۔ خواہ وہ ہار ہی کیوں نہ گیا ہو۔ اور اپنی شکست کا جام

نوش کرنے پر مجبور ہو۔ گویا مقابلے کی حالت میں بھی وہ اپنا شریفانہ وقار بدستور قائم رکھتا ہے۔''

یہ درست ہے کہ وہ فرائض' نیکی اور اس قسم کے دوسرے تصورات پر بہت زور دیتا ہے۔ لیکن یہی تو اخلاقی معلم کی مجبوری ہے۔ اس کے باوجود وہ فطرت یا فطری جذبوں کے خلاف انسان سے کوئی تقاضا نہیں کرتا۔ ذیل کا مکالمہ اس نکتہ کی وضاحت کرتا ہے:

''ڈیوک آف شی چائر کنفیوشس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ''ہمارے ہاں ایک ایسا حق پرست شخص موجود ہے کہ جب اس کے باپ نے کہیں سے ایک بھیڑ چرا لی' تو اس دیانت دار بیٹے نے باپ کے خلاف گواہی دینے میں کوئی عذر محسوس نہ کیا۔'' کنفیوشس نے جواب دیا ''لیکن ہمارے ملک میں دیانت کا مفہوم کچھ اور ہے۔ باپ اپنے بیٹے کے گناہ پر پردہ ڈالتا ہے۔ اور بیٹا باپ کے عیب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔'' دراصل یہی عمل دیانت کے صحیح مفہوم کا مظہر ہے۔

کنفیوشس ہر معاملے میں اعتدال پسند تھا۔ حتیٰ کہ نیکی میں بھی۔ وہ اس بات کا قائل نہیں تھا کہ ہمیں برائی کا بدلہ بھی بھلائی سے دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر جب اس سے سوال کیا گیا کہ ''بدی کے عوض' بھلائی پیش کرنے کے اصول کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے۔'' تو اس کا جواب یہ تھا کہ ''پھر بھلائی کے بدلے کیا پیش کیا جائے گا۔'' درحقیقت بے انصافی کا ازالہ انصاف ہی سے ہوسکتا ہے اور نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا چاہئے۔ ہاں البتہ اس کے زمانے میں ''برائی کے بدلے بھلائی'' کا سبق تاؤ کے پیروکار پڑھا رہے تھے۔ تاؤ مذہب کا بانی لاؤتزد تھا۔ جسے کنفیوشس کا بلحاظ عمر بزرگ تر ہم عصر قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تعلیمات کنفیوشس کے برعکس عیسائیت سے زیادہ قریب ہیں۔ چنانچہ اس کا قول یوں ہے کہ ''نیکوکار کے لئے بے شک میرے پاس نیکی ہے۔ لیکن وہ جو بدکار ہیں ان کو پیش کرنے کے لئے بھی میرے پاس صرف نیکی ہی ہے تا کہ انہیں راہ راست پر لا سکوں۔ وہ جو وفا پرست ہیں ان کی وفا کے جواب میں میرے پاس بھی وفا ہے۔ لیکن وہ جو بدعہد ہیں ان کے لئے بھی میرے پاس وفا کے سوا اور کچھ نہیں تا کہ وہ بھی وفا پرست بن جائیں۔ اگر ایک شخص برا ہے تو یہ کہاں کی خوبی ہے کہ اسے یکسر رد کر دیا جائے۔ زخم تو رحم سے مندمل ہوتا

ہے۔'' تاؤ کے بعض اقوال حیرت انگیز حد تک ''پہاڑی کے وعظ'' سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

''وہ جو عجز سے کام لیتا ہے وہ سلامت رہے گا۔ جو انکسار سے جھک جاتا ہے اسے سہارا دیا جائے گا کہ سیدھا کھڑا ہو سکے۔ وہ جو خالی ہاتھ ہے اسے مالا مال کر دیا جائے گا۔ جس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے اسے تازہ دم کر دیا جائے گا۔ جس کا سرمایہ قلیل ہے اسے نہال کر دیا جائے گا۔ اور جو مال دار ہے وہ راہ راست سے بھٹک جائے گا۔''

چین کے متعلق خاص بات یہ ہے کہ تاؤ کی بجائے دانشور کا منصب یہاں کنفیوشس کو سونپا گیا۔ تاؤ کا مسلک بے شک آج بھی موجود ہے۔ تاہم اس کا حلقہ اثر جادو ٹونے کی حیثیت سے جہلاء تک محدود ہے۔ ان باعمل لوگوں کے لئے جن کے ہاتھوں میں زمام کار تھی تاؤ کا مذہب خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ کنفیوشس کے بنائے ہوئے اصولوں میں یہ اہلیت موجود تھی کہ ان کی مدد سے مناقشات سے نپٹا جا سکے۔ تاؤ کا نظریہ عمل کی نفی کرتا ہے۔ اس کا قول یہ ہے کہ ''ریاست ہمیشہ اس طرح وجود میں آتی ہے کہ حالات واقعات کو اپنی ڈگر پر چلنے دیا جائے۔ وہ جو ہمہ وقت مصروف عمل رہنے کے دعویدار ہیں، وہ ریاست وحکومت کے اہل نہیں۔''

چینی حکمران کنفیوشس کے زیر اثر ہی سہی، تاہم وہ ضبط نفس، ترحم اور انکسار کے قائل تھے۔ کہ یہ اصول ''خیر'' کے نافذ العمل ہونے کے لئے ہر باشعور حکومت کے لئے لازمی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ سفید فام قوموں کے برعکس یہ بات چینیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اخلاقی نظام کی نظریاتی اساس، اور اس کے عملی نفاذ میں کوئی تفاوت ہو سکتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ان کا عمل ہمیشہ ان کے نظریات پر پورا اترتا رہا تاہم وہ ایسا کرنے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ اور ان سے ایسی توقع بوجوہ وابستہ بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس، عیسائی اخلاقیات کے متعلق یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ اس دنیائے دوں میں قابل نفاذ نہیں۔ اخلاقیات کے اس معیار تک پہنچنا اس دنیائے شر میں ناممکن ہے۔

بالفعل ہمارے ہاں دو طرح کے اخلاقی نظام ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک وہ جس کی ہم

تعلیم دیتے ہیں لیکن خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے اور دوسرا وہ جس پر ہم عمل پیرا ہیں۔ لیکن اس کی تلقین نہیں کرتے۔ عیسائیت نے جملہ مذاہب کی طرح (مارموزم کو چھوڑ کر) ایشیا میں جنم لیا۔ چنانچہ ابتدائی صدیوں میں اس مذہب میں بھی فرد کے ذاتی اعمال اور حیات اخروی کے تصور کو بہت اہمیت حاصل رہی جو ایشیائی روحانیت کی خصوصیات ہیں۔ اس نکتہ نظر سے عدم مدافعت کا تصور قابل فہم ہے۔ لیکن جب یورپ کے اولوالعزم حکمرانوں نے رسمی طور پر عیسائیت کو بطور مذہب قبول کر لیا تو پھر لازماً یہ تصور بھی در آیا تھا کہ مذہبی صحیفوں کے تمام تر متون کو من وعن قبول نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس قسم کے اقوال کی ''جو سیزر کا ہے اسے سیزر کے حوالے کر دو۔'' تشہیر ضرورت زیادہ ہوئی۔ ہمارے موجودہ عہد میں صنعتی مقابلہ بازی کے پیش نظر عدم مدافعت کے حق میں یہ خفیف تر رجحان بھی قابل نفرین قرار پاتا ہے۔ لوگوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنا علم بند رکھیں گے۔ عملاً ہماری فعال اخلاقیات کا مقصود مادی تمتع ہے جو کوشش تمام کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اصول اقوام اور افراد پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ہمیں ہیچ اور احمقانہ نظر آتا ہے۔

چینی نہ تو ہماری نظریاتی اخلاقیات کے قائل ہیں نہ اس کے عملی اطلاق کے۔ نظریاتی حد تک وہ یہ مان لیتے ہیں کہ ایسے مواقع یقیناً آتے ہیں جہاں جدوجہد روا اور جائز ہوتی ہے لیکن عملی طور پر یہ مواقع شاذ و نادر ہی درپیش آتے ہیں۔ ان کے برعکس ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نظریاتی طور پر جنگ و جدال کو کسی حال میں بھی روا قرار نہیں دیتے۔ لیکن عملاً محاذ آرائی کو ہر لحظہ ناگزیر پاتے ہیں۔ چینی بھی بعض اوقات خروش آمادہ ہوتے ہیں لیکن وہ اصلاً جنگجو قوم نہیں ہیں۔ جنگ ہو یا تجارت وہ ان میں کامیابی کو بنیادی حیثیت نہیں دیتے۔ ان کی روایت کی رو سے کسب علم کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ اسی حصول علم سے وابستہ شائستگی اور عجز و انکسار کو تفویض کیا جاتا ہے۔ گزشتہ عہد میں قرن ہا قرن تک ان کے ہاں یہ طریقہ رائج رہا کہ انتظامی عہدے مقابلے کے امتحانوں کے نتائج پر پر کئے جاتے تھے۔ گزشتہ دو ہزار سال سے چین میں خاندانی اشرافیہ یا جاگیرداری کی روایت موجود نہیں۔ البتہ کنفیوشس کے خاندان کا سربراہ ڈیوک کہلاتا تھا چنانچہ علمیت کو چین میں وہی احترام اور وقار حاصل تھا جو جاگیردارانہ یورپ میں بااثر جاگیرداروں کے لئے مخصوص تھا۔ انتظامی عہدوں سے قطع نظر علم وفضل بذاتہٖ عزت و احترام کا حامل تھا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ قدیم علمی روایت میں چینی

کلاسیکی ادب اور اس کے مسلمہ شارحین کی تصنیفات اور ان کا مقلدانہ مطالعہ ہی علم کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ آج مغرب کے زیر اثر ازمنہ قدیم کی اخلاقی درسیات کے مقابلے میں جغرافیہ' اقتصادیات' علم طبقات الارض' کیمیا وغیرہ کو زیادہ عملی افادیت کا حامل سمجھا جانے لگا ہے۔ جدید چین میں جن طلبہ کی تربیت جدید یورپی نصاب تعلیم کے مطابق ہوتی ہے وہ جدید عہد کی ضروریات سے کماحقہ آگاہ ہیں۔ اور اس اعتبار سے ان کے ہاں پرانی روایات کا پہلے جیسا احترام موجود نہیں۔ اس طرح کی معدودے چند مستثنیات سے قطع نظر جدید عہد کے اکثر و بیشتر چینی اب بھی اعتدال پسندی' نرم خوئی اور پرسکون مزاج کی روایتی خوبیوں کے حامل ہیں۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ آئندہ چند قرنوں میں یہ خوبیاں مغربی اور جاپانی اثرات کا مقابلہ کر سکیں گی یا نہیں۔ اگر مجھے ایک جملے میں اس خاص فرق کو ظاہر کرنے کے لئے کہا جائے جو ہمارے اور چینیوں کے درمیان پایا جاتا ہے تو میں یوں کہوں گا کہ ان کا رویہ بنیادی طور پر لطف اندوزی کا حامل ہوتا ہے۔ جبکہ ہمیں طاقت اور قوت کا حصول سرگرداں رکھتا ہے۔ ہم اپنے ہم جنسوں پر اقتدار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فطرت پر بھی بے محابا تصرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے مقصود کے لئے ہم مضبوط حکومتیں قائم کرتے ہیں اور دوسرے کے لئے سائنسی علوم کو ترقی دیتے ہیں۔ سہل پسند نیک خو چینی اس قسم کے مشقت طلب کاموں سے سروکار نہیں رکھتے۔ یہ جو میں نے انہیں سہل پسند کہا ہے تو اس کی بھی ایک حد ہے۔ کیونکہ چینیوں کی سہل پسندی اس نوع کی نہیں ہے جو روسیوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ اپنی بقاء کے لئے وہ جفاکشی اور تندہی سے گریز نہیں کرتے۔ فرق یہ ہے کہ محنت و مشقت سے ان کی غرض وہ نہیں ہوتی جس کے لئے امریکی یا مغربی یورپ کے لوگ محنت کرتے ہیں۔ یعنی اگر یہ موخر الذکر لوگ اپنے آپ کو مصروف نہ رکھیں تو اکتاہٹ کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چینی ہنگامہ پسند بھی نہیں۔ جب ان کے گزر بسر کے لئے ساز و سامان موجود ہو تو جو ہے وہ اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ اسے خواہ مخواہ بڑھانے کا جنجال نہیں پالتے۔ فرصت کے لمحات سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے ان کی صلاحیت لامحدود ہے۔ مثلاً تھیٹر دیکھنا' چائے نوشی کے دوران دلچسپ گفتگو' قدیم چینی فنون کی تحسین اور اگر کچھ نہ ہو تو خوش منظر ماحول میں چہل قدمی۔ زندگی بسر کرنے کے اس انداز میں جو نرم روی پائی جاتی ہے وہ ہمارے سوچنے کے انداز کی رو سے ناروا ہے۔ ہم تو بس اس شخص کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو ہر روز

باقاعدہ دفتر جائے۔ خواہ وہاں بیٹھ کر جو کارروائیاں وہ کرتا ہے وہ کتنی ہی ضرر رساں کیوں نہ ہوں۔

مشرق میں زندگی بسر کرنا سفید فام لوگوں کے ہاں بالعموم بدعنوانی کا باعث بنتا ہے۔ لیکن میں بغیر کسی جھجک کے اقرار کرتا ہوں کہ جب سے مجھے ''چین آشنائی'' حاصل ہوئی ہے تب سے میں نے بھی سہل پسندی کو ان صفات میں شامل کر لیا ہے جو بحیثیت مجموعی انسان کے لئے ایک نعمت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم جو کچھ حاصل کرتے ہیں عزم و ہمت ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح جو کچھ ہمیں میسر آتا ہے وہ فائدہ رساں بھی ہے یا نہیں۔ ہم نے بے شک صنعت و حرفت میں حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی ہے۔ اس مہارت سے اگر ایک طرف ہم جہاز' موٹر کار' ٹیلیفون اور بہت سا دوسرا سازوسامان بناتے ہیں جو آرام اور ٹھاٹھ سے زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہوتا ہے تو دوسری طرف یہی مہارت توپ تفنگ' زہریلی گیس اور ہوائی جہاز بناتی ہے جن کے ذریعے ہم ایک دوسرے کو یکسر ملیامیٹ کر دینے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں انتظامیہ اور ٹیکسوں کی وصولی کا بہترین نظام موجود ہے۔ اس انتظامیہ کا ایک شعبہ تعلیم کے فروغ' حفظان صحت اور دوسرے مفید کاموں کے لئے وقف ہے تو دوسرا شعبہ جنگ و جدل کے اہتمام میں مصروف ہے۔ انگلستان میں ان دنوں قومی آمدنی کا بیشتر حصہ گزشتہ جنگوں کے نقصانات کی تلافی اور آئندہ جنگوں کے اہتمام و انصرام میں جھونک دیا جاتا ہے۔ اور جو تھوڑا بہت بچتا ہے صرف وہی بہبود کے کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ براعظم یورپ کے اکثر ملکوں میں تو صورتحال اور بھی بدتر ہے۔ ہماری پولیس کا نظام بے مثال کارکردگی کا اہل ہے۔ یہ نظام ایک طرف جرائم کی تفتیش اور بیخ کنی میں مصروف ہے تو دوسری طرف یہی نظام ہر شخص کو جو نئے سیاسی نظریات پیش کرنا چاہتا ہے (خواہ وہ تعمیری نوعیت ہی کے کیوں نہ ہوں) پابند سلاسل کرنے کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک چین میں اس قسم کی بات نہیں ہوتی تھی۔ ان کی صنعت نہ موٹر کاریں بناتی تھیں نہ بم۔ حکومت نہ اپنے باشندوں کو تعلیم دلانے کی سعی کرتی تھی نہ دوسرے ملک کے باشندوں کو ہلاک کرنے کی۔ پولس نہ چوروں ڈاکوؤں کی سرکوبی کرتی تھی نہ بالشویک تحریک کے حامیوں کو پکڑتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ چین میں سفید فام ملکوں کے مقابلے میں سب کے لئے آزادی اور ایک خاص طرح کی نیم سرخوشی کے مواقع

زیادہ تھے۔ اس اعتبار سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس وقت ایک مختصر اقلیت کو چھوڑ کر بیشتر آبادی افلاس زدہ تھی۔

ایک عام درجے کے چینی شہری کی سوچ کا مقابلہ اگر مغرب کے عام شہری کی سوچ سے کیا جائے تو دو واضح فرق سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ چینی تگ و دو کو صرف اس حالت میں گوارا کرتے ہیں جب وہ کسی مفید مقصد پر مرکوز ہو۔ دوسرے یہ کہ ان کے نزدیک اخلاقیات کا مقصد یہ نہیں کہ لوگوں کے فطری جذبات پر بند باندھ دیئے جائیں۔ ان میں سے پہلے نکتہ سے ہم اوپر بحث کر آئے ہیں۔ لیکن دوسرا بھی اتنا ہی اہم اور توجہ طلب ہے۔ پروفیسر گائلز' جو چین کے حالات و معاملات کے متعلق ایک امتیازی استناد کے حامل ہیں' اپنے گفرڈ خطبات کے اختتام پر جن کا موضوع کنفیوشزم اور اس کے حریف تھا' اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ چین میں عیسائی مشن کی کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ''ازلی گناہ'' کا تصور تھا۔ قدامت پسند عیسائیت کے اس روایتی نظریئے کی رو سے (جس کی تبلیغ میں اب بھی بہت سے پادری مشرق بعید میں مصروف عمل ہیں) ہم سب پیدائشی طور پر اتنے گناہگار ہیں کہ ابدی سزا ہمارا مقدر ہے۔ چینی اس نظریئے کو اس حد تک قبول کرنے پر تو آمادہ ہو سکتے تھے کہ اس کا اطلاق صرف سفید فام لوگوں پر ہوتا ہے لیکن جب انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے آباؤ اجداد دوزخ کی آگ کا ایندھن بن چکے ہیں تو وہ اسے گوارا نہیں کر سکتے۔ کنفیوشس کی تعلیم تو یہ تھی کہ انسان پیدا تو نیک ہوتا ہے بعد میں اگر وہ گناہ کرتا ہے تو اس کی وجہ صحبت بد ہوتی ہے۔ یا برے اطوار۔ روایتی مغربی قدامت پسند مذہب سے اختلاف کا یہ نکتہ چینیوں کے انداز نظر کی تفہیم میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے ہاں اخلاقی اقدار کے مشعل بردار زندگی میں ترک لذات پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کے ہاں تمتع اور لذت کوشی کے رجحان سے تعرض کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں نیکوکار کے تصور کے ساتھ خدائی فوجدار کا تصور بھی برسرکار رہتا ہے۔ جب تک کوئی شخص دوسروں کے لئے وبال جان نہ بن جائے اس وقت تک ہم نیکوکاری میں اس کے امتیاز کے قائل ہی نہیں ہوتے۔ یہ رویہ ازلی گناہ کے تصور سے ابھرتا ہے۔ دوسروں کے معاملات اور آزادی میں مداخلت بے جا کے علاوہ یہ ایک طرح کی منافقت کو بھی جنم دیتا ہے۔ روایاتی معیاری نیکی کا حصول عام لوگوں کے بس کی بات نہیں چین میں صورت حال یوں نہیں ہے۔ اخلاقی

اصول منفی ہونے کی بجائے مثبت اساس ہیں۔ ایک انسان سے یہ امید وابستہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے والدین کا ادب کرے گا۔ اپنے بچوں کے ساتھ شفقت کا سلوک کرے گا۔ اپنے حاجت مند اقرباء کے لئے سخاوت کا مظاہرہ کرے گا۔ اور ہر ایک سے فروتنی کے ساتھ پیش آئے گا۔ یہ فرائض کچھ ایسے کڑے نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر لوگ توازخود ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہمارے ہاں کے بلند تر' ناقابل عمل معیار خیر کے مقابلے میں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔

گناہ کے تصور کی عدم موجودگی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ لوگ مغرب کے علی الرغم باہمی اختلافات کو قیل وقال سے طے کر لیتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں ذاتی اختلاف رائے' بہت جلد اصولی (یعنی ناقابل مفاہمت) اختلاف کا روپ دھار لیتا ہے۔ دونوں طرف سے ایک ہی دعویٰ دہرایا جاتا ہے کہ فریق مخالف حامل شر ہے۔ اس کی بات مان لینا گویا اس کے جرم میں شریک ہونے کے برابر ہے۔ اس وجہ سے باہمی مناقشات میں تلخی آ جاتی ہے۔ جو بالآخر قوت کے عملی استعمال پر منتج ہوتی ہے۔ اگرچہ چین میں بھی جنگ آزما موجود تھے اور وہ قوت کے استعمال کی طرف راغب بھی تھے۔ تاہم ان کے سپاہی تک ان کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کے ہاں جنگیں ہوتیں تو ان میں بے دریغ خون نہیں بہایا جاتا تھا۔ اور ان سے وہ نقصانات بروئے کار نہیں آتے تھے جو ہمارے تجربے کے مطابق ہر جنگ سے متوقع ہوتے ہیں۔ عوام کی اکثریت سول انتظامیہ سمیت اپنے کام میں اس طرح مشغول رہتے تھے جیسے یہ جرنیل اور ان کی سپاہ کسی حیثیت کے حامل ہی نہیں۔ عام حالات میں جھگڑے کسی تیسرے فریق کی دوستانہ ثالثی کے ذریعے طے کر لئے جاتے ہیں۔ سمجھوتہ ان کے ہاں مسلمہ اصول ہے۔ کیونکہ اسی کے طفیل فریقین کا بھرم قائم رہتا ہے۔ یہ بات بعض صورتوں میں اغیار کو تمسخر آمیز لگتی ہے تاہم اسے ایک اہم سماجی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔ جس سے سماجی اور سیاسی طرز عمل میں سنگدلی باقی نہیں رہتی جو ہمارے ہاں عام ہے۔

چینی نظام حیات میں ایک اور صرف ایک اہم خامی پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس نظام نے چین کو ہٹ دھرم قوموں کے خلاف مدافعت کے قابل نہیں چھوڑا۔ اگر پوری دنیا چین جیسی ہو تو یقیناً دنیا میں بہجت کا دور دورہ ہوگا۔ لیکن جب تک دوسری قوموں کے ہاں جنگ جوئی اور مہم پسندی کے رجحانات کارفرما ہیں چین جو آج پہلے کی طرح باقی دنیا سے الگ

تھلگ نہیں رہا' بالآخر مجبور ہو جائے گا کہ مغرب کے عیوب کو کسی حد تک اپنا لے۔ کہ آزادی
کو برقرار رکھنے کے لئے اس کے بغیر اور چارہ کار نہیں ہے۔ بایں ہمہ یہاں اس خوش فہمی
کے لئے گنجائش نہیں ہے کہ تقلید کی یہ روش لازماً اصلاح احوال کی ضامن ہو گی۔

ذہنی کائنات کی توسیع

جدید علم نے ہماری ذہنی زندگی پر بہت سے اور مختلف اقسام کے اثرات مرتب کئے ہیں۔ آئندہ ان میں اور بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ ذہنی اعمال کو روائتی طور پر تین شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ سوچ (ادراک) ارادہ اور احساس یا جذبہ اس تقسیم کا سائنسی جواز تو موجود نہیں ہے لیکن افہام وتفہیم کے لیے یہ آسانیاں مہیا کرتی ہے۔ اس لیے میں اسے قبول کرتا ہوں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جدید علم نے بنیادی طور پر ہمارے ادراک کو متاثر کیا ہے تاہم اس نے ارادہ کے میدان میں بھی اہم اثرات مرتب کئے ہیں اور اسی طرح احساس اور جذبہ کو بھی متاثر کیا ہوگا۔ اگرچہ یہ اثرات ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئے۔ میں سب سے پہلے خالص شعوری اثرات یا مدرکات کا ذکر کروں گا۔

ایک نظریے کی رو سے جسے بہت سے ماہرین فلکیات کی تائید حاصل ہے مادی کائنات مسلسل وسعت پذیر ہے (پھیلتی چلی جا رہی ہے)۔ ہر وہ چیز جو پہلے بھی ہم سے کچھ زیادہ قریب نہیں تھی اب اور بھی دور ہوتی جا رہی ہے۔ اور جو پہلے بھی دور تھیں وہ دور تر ہوتی جا رہی ہیں۔ جو لوگ اس نظریے پر یقین رکھتے ہیں ان کے خیال میں کائنات کے دور دراز مقامات مسلسل اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک ذہنی کائنات کی توسیع کا سوال ہے۔ اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو لوگ کائنات کے اس تصور سے آشنا ہیں جو سائنس نے پیش کیا ہے انہیں اپنے تخیل کو زمان و مکان میں ان حدوں تک کشادہ کرنا

پڑے گا جن کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ ہمارے عہد میں بھی بعض لوگوں کے ہاں اس کا تصور تکلیف دہ حد تک حیرت انگیز ہے۔

خلا میں وسعت پذیری کے تصور کا آغاز یونانی ماہرین فلکیات سے ہوا۔ انا کسا غورث (جسے پیرا کلیز ایتھنز میں فلسفے کی تدریس کے لیے لایا تھا۔) کا خیال یہ تھا کہ سورج پیلوپونیسس (Poloponnesus) جتنا حجم رکھتا ہے اگرچہ اس کے ہمعصر اسے بیجا مبالغہ قرار دیتے تھے۔ تاہم اس کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ماہرین نے زمین سے چاند اور سورج کا فاصلہ ناپنے کا طریقہ جان لیا۔ اگرچہ ان کی پیمائش صحیح تو نہیں تھی البتہ اس سے یہ واضح ہو جاتا تھا کہ سورج کرہ ارض سے کئی گنا زیادہ بڑا ہے۔ پوسی ڈونیس نے (Poseidonius) جو سرد کا اتالیق تھا فاصلے کا جو تعین کیا تھا وہ اس قدیم زمانے میں قرین صحت تھا۔ تاہم وہ صحیح فاصلے کے نصف کو ہی پہنچتا ہے۔ اس کے بعد کے ماہرین کے اندازے اس کے مقابلے میں غلط تھے۔ تاہم وہ سب اس بات سے آگاہ تھے کہ نظام شمسی کے مقابلے میں زمین کا حجم کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

قرون وسطیٰ میں ذہنی پسماندگی کا دور دورہ تھا۔ یونانیوں کا حاصل کردہ بہت سا علم ضائع ہو چکا تھا۔ قرون وسطیٰ میں کائنات کا سب سے بہتر تصور دانتے نے پراڈ سو (Paradiso) میں پیش کیا۔ اس تصور میں بہت سے محوری نظام ہیں جن میں چاند سورج، دوسرے سیارے، ساکن ستارے اور Empyrean شامل ہیں۔ دانتے نے بیترس کی رہبری میں ان سب کا سفر 24 گھنٹوں میں طے کر لیا تھا۔ جدید ذہن کے لیے اس کا پیش کردہ Cosmos نا قابل قبول حد تک چھوٹا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس کی پیش کردہ کائنات اس کائنات کے مقابلے میں جس میں آج ہم زندہ ہیں سمندری طوفان کے مقابلے میں گھر کے اندر بنی ہوئی ایک تصویر کے برابر ہے۔ اس کی مادی دنیا میں کوئی اخفا نہیں ہے۔ گہری گھاٹیاں نہیں ہیں۔ ان جانی دنیاؤں کا بے ہنگم جمگھٹا نہیں ہے۔ یہ کائنات پرسکون، آرام دہ ہے۔ انسانی ماحول کے مطابق ہے۔ اور حرارت بخش۔ لیکن وہ لوگ جو جدید علم فلکیات سے واقف ہیں ان کے لیے یہ تصور آسمانوں کی آزاد کھلی فضاؤں کے مقابلے میں زنداں کی بھنچی ہوئی فضا سے مشابہ ہے۔

سترہویں صدی کے بعد سے کائنات کے متعلق ہمارے تصورات مکان و زماں کے

حوالے سے وسعت پذیر ہیں اور ماضی قریب میں یہ وسعت حد نا آشنا ہی رہی ہے۔ سورج کا فاصلہ یونانیوں کے تصور سے کہیں زیادہ ہے اور بعض دوسرے ستارے تو سورج سے بھی زیادہ دوری پر واقع ہیں۔ قریب ترین ستارہ بھی سورج سے کہیں زیادہ دور ہے۔ سورج کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں تقریباً 8 منٹ لگتے ہیں۔ لیکن قریب ترین ستارے کی روشنی کو یہاں تک پہنچنے میں تقریباً چار سال لگتے ہیں۔ جن ستاروں کو ہم الگ الگ' آلات کی مدد کے بغیر دیکھ سکتے ہیں اور جو ہمارے قریب ترین ہمسائے ہیں ان کا مجموعہ کہکشاں کہلاتا ہے یا عوامی زبان میں ستاروں کا یہ ایک جھرمٹ ہے جسے ہم آلات کی مدد کے بغیر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ لاکھوں کروڑوں ایسے جھرمٹوں میں سے صرف ایک ہے۔ ہم کہہ نہیں سکتے کہ ایسے کتنی کہکشائیں اور بھی موجود ہیں۔

چند اعداد و شمار تخیل کی رہبری کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ قریب ترین ستارے کا فاصلہ پچیس ہے' (یاد رہے ایک ملین دس لاکھ کے برابر ہوتا ہے) اس طرح یہ فاصلہ 250 x 250 =62500 لاکھ میل بنتا ہے کہکشاں میں جو ہماری سیر گاہ ہے تقریباً تیس سو ہزار یعنی تین لاکھ ملین ستارے شامل ہیں۔ اس قسم کی اور بھی کئی ملین کہکشائیں موجود ہیں۔ ان کا درمیانی فاصلہ روشنی تقریباً 2 ملین سالوں میں طے کرتی ہے۔

کائنات میں مادے کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ سورج کا وزن تقریباً دو بلین بلین بلین ٹن ہے۔ کہکشاں کا وزن سورج کے مقابلے میں 160 ہزار ملین گنا ہے اور ایسی لاکھوں کروڑوں کہکشائیں اور بھی ہیں۔ لیکن مادے کی اس مقدار کے باوجود کائنات کا بہت سا حصہ خلاء محض ہے۔

اسی طرح وقت کے متعلق بھی اپنے تصورات کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کا احساس ہمیں پہلے پہل علم طبقات الارض اور علم Paleontology نے دلایا تھا۔ متحجر ڈھانچوں اور چٹانوں کے مطالعہ نے زمین کی گزشتہ تاریخ کے تصور کو روشن کیا جو لازماً بہت زیادہ طویل ہے۔ پھر نظام شمسی کی ابتداء اور اس کے متعلق نظریات سامنے آئے۔ اب طاقتور دوربینوں کی مدد سے ہم ایسے اجرام کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو ہم سے اتنے دور ہیں کہ ان کی روشنی کو یہاں تک پہنچنے میں 500 ملین سال لگتے ہیں چنانچہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ ماضی بعید کا واقعہ ہے۔

جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں اس کا تعلق تصورات (سوچ بچار) میں ہمارے ذہنوں کی کشادگی سے ہے۔ اب میں ان اثرات کا جائزہ لوں گا جو ارادے اور احساسات (جذبات) کے جہاں میں نمو پذیر ہوئے ہیں۔

وہ لوگ جو آج تک صرف ارضی ماحول ہی سے واقف تھے اور جنہوں نے زمان و مکاں کی وسعتوں میں کبھی نہیں جھانکا تھا ان کے لیے کائنات کے اس وسیع و عریض تصور کے مقابلے میں انسان اور اس کے معاملات کا چھوٹا پن ابتداء میں حیرت ناک بے بس کر دینے والا اور اعصاب شکن محسوس ہوتا ہے۔ تاہم یہ تاثر قابل اعتبار نہیں ہے کیونکہ عقل پر مبنی نہیں ہے۔ صرف عجم کی پرستش یا اس سے مرعوب ہونا بے معنی بات ہے ہم کسی موٹے آدمی کو اس کے موٹاپے کی وجہ سے دبلے آدمی کے مقابلے میں عزت کا مستحق نہیں سمجھتے۔ سر آئزک نیوٹن، دریائی گھوڑے کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ تاہم اسے اس وجہ سے اس عظیم الجثہ جانور سے حقیر نہیں گردانتے۔ انسان کے ذہن کی پیائش (اگر اس ترکیب کا استعمال جائز ہے) اس کے جسم کی پیائش کے حوالے سے نہیں کی جاتی۔ اس کی پیائش تو اس کائنات کے حجم اور پیچیدگی کے حوالے سے کی جائے گی جسے وہ اپنی سوچ اور تخیل میں سمیٹ لیتا ہے۔ جوں جوں ماہر فلکیات کا علم کائنات کے متعلق بڑھتا ہے ویسے ہی ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں بھی وسعت آ سکتی ہے اور آنی چاہیے۔ جب میں کہتا ہوں تو ذہن سے میری مراد کلی ذہن ہوتا ہے نہ کہ صرف اس کا ادراک سے تعلق رکھنے والا حصہ۔ ارادے اور جذبے کو بھی ادراک کا ہم قدم ہونا چاہیے۔ تبھی انسان اپنے علم کی افزائش کے ساتھ ترقی کر سکے گا۔ اگر یوں نہیں ہوسکتا یعنی فہم و ادراک تو کائناتی ہو جائیں لیکن ارادہ اور جذبہ ارضی ہی رہے تو ایک ایسی بے آہنگی وجود میں آئے گی جو ایک طرح کے پاگل پن کا باعث بنے گی اور نتیجہ تباہ کن ہو گا۔ اب تک ہم نے صرف ادراک کی بات کی ہے۔ اب میں دانائی کا ذکر کروں گا جو ادراک ارادے اور جذبے کی ہم آہنگی کا نام ہے۔

تو ارادے سے شروع کرتے ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہیں انسان حاصل کر سکتا ہے اور بعض چیزیں ناقابل حصول ہوتی ہیں۔ مثلاً کینیوٹ کا سمندر کو حکم دینا کہ وہ مائل بہ خروش نہ ہو۔ جو چیزیں انسان کے بس میں نہیں ہیں ان کے متعلق ارادے کے عجب کو ظاہر کرتا ہے وہ کام جو انسان کے بس میں ہیں۔ ان کا دائرہ ماضی میں بہت محدود تھا بُرے آدمی

اپنی نیت کے فتور کے باوجود بہت کم نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اسی طرح اچھے لوگ اپنی نیک نیتی سے بہت کم بھلائی کر سکتے تھے۔ لیکن علم کی ترقی کے ساتھ انسان کی فتوحات میں بھی ترقی ہوئی۔ سائنس کی موجودہ دنیا میں اور اس سے بھی زیادہ آنے والے قریبی زمانے میں بُرے لوگ شاید زیادہ نقصان پہنچانے اور بھلے لوگ زیادہ بھلائی پہنچانے پر قادر ہو جائیں اور یہ اس اندازے سے زیادہ ہو جائے جو ہمارے آباؤ اجداد کے خواب و خیال میں تھا۔

قرون وسطی کے اختتام تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مادے کی چار اقسام ہیں۔ جنہیں ہم زمین کے اجزاء سمجھتے تھے۔ یعنی مٹی، پانی، ہوا اور آگ (آب و آتش خاک و باد) جوں جوں اس نظریے کی خامی واضح ہوتی گئی ویسے ہی بنیادی عناصر کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ تاآنکہ ان کی تعداد 92 تک پہنچ گئی۔ ایٹم کی جدید تحقیقات نے ان نئے مادی اجزاء کی تخلیق کو بھی ممکن بنا دیا ہے جو قدرتی طور پر نہیں پائے جاتے یہ افسوس کا مقام ہے کہ یہ نئے اجزاء سب کے سب ضرر رساں ہیں اور ان کی معمولی سی مقدار بہت سے لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتار سکتی ہے اس اعتبار سے سائنس مفید علم ثابت نہیں ہوا۔ تاہم اس کے برعکس سائنس نے امراض کے مقابلے میں انسانی زندگی کو طول دینے میں کچھ معجزے بھی دکھائے ہیں۔

اب تک انسانی قوتوں کا فروغ ارضی معاملات تک محدود رہا ہے۔ پہلے سے کہیں زیادہ ہم اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ کرہ ارض پر حیات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکیں اور اگر ہمارے جی میں آئے تو اسے یکدم ملیامیٹ کر دیں۔ لیکن اگر ہم نے کسی پاگل پن کی رو میں بہ کر انسانی حیات کو ختم نہ کر دیا تو ہم یقیناً اس مقام پر آ پہنچے ہیں جہاں ہمارے سامنے انسانی قوت کے فروغ کے امکانات بہت وسیع ہیں۔ اگر اخراجات اجازت دیں تو ہم چاند پر ایک مہم روانہ کر سکتے ہیں۔ (یہ ہو چکا ہے مترجم) اور ہم میں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم چاند کو انسان کے رہائش کے قابل بنا سکتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ زہرہ اور مریخ زیادہ عرصہ ہماری دسترس سے باہر رہ سکیں۔ اس دوران جیسا کہ سینیٹر جانسن نے سینیٹ میں بیان کیا، سائنسی طاقتیں ہمارے کرہ ارض پر بھی حیرت انگریز تبدیلیاں لا سکتی ہیں۔ اس کے اپنے الفاظ میں سائنس کو زمین پر موسم پر قدرت حاصل ہو جائے گی اور یوں سیلاب یا خشک سالی اپنے بس کی بات ہو گی۔ لہروں کا رخ موڑا جا سکے گا

اور سمندر کی سطح بلند ہو سکے گی۔ خلیج کے بہاؤ کا رخ موڑا جا سکے گا اور معتدل درجہ حرارت کو نکتہ انجماد تک لے جایا جا سکے گا۔

جب ہمیں یہ زبردست قوت حاصل ہو جائے گی تو ہم اس سے کیا کام لیں گے؟ انسان کا وجود تاحال برقرار ہے تو محض اس کی جہالت اور نااہلیت کی وجہ سے۔ یہ ایک مغلوب الغضب جاندار ہے اور جابر اشخاص جو ہمیشہ موجود رہے ہیں وہ جتنا نقصان پہنچا سکتے تھے پہنچا کر رہے تاہم ان کی کارروائی ان کے حربوں کی محدود کارروائی کی وجہ سے محدود ہی رہی۔ اب یہ حد بندی ختم ہو رہی ہے۔ اگر ہم اپنی برتر صلاحیتوں سے انہی مقاصد کے حصول میں کوشاں رہے جو ماضی میں ظالموں کا شیوہ تھا تو ہم اپنے آپ کو تباہ و برباد کر ڈالیں گے اور وینوسار کی طرح معدوم ہو جائیں گے۔ ایک وقت تھا کہ زندگی میں یہاں انہی کا سکہ چلتا تھا انہوں نے اپنے جسموں پر بے شمار سینگ اگا لئے تھے۔ جو انہیں مقابلوں میں فتح سے ہمکنار کرتے تھے تاکہ کوئی اور نسل ان پر غلبہ نہ پا سکے۔ تاہم وہ دنیا کو چھوٹے چھوٹے چوہے جیسے جانوروں کے لیے چھوڑ کر معدوم ہو گئے۔

اگر ہم نے اپنی صلاحیتوں کو عقلمندی سے استعمال نہ کیا تو ہمارا حشر بھی انہی جیسا ہو گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ چاند پر مخالف قوتوں کے جہاز بیک وقت اتر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایچ۔ بم ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔ لیکن جب تک ہم کارزمیں کو صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے ہمیں چاہیے کہ چاند کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ اب تک ہماری حماقتیں کرہ ارض تک محدود تھیں۔ انہیں کائناتی حدود تک لے جانا ایک مشکوک نوعیت کی کامیابی ہو گی۔

وہ بڑھتی ہوئی قوت جو سائنس نے انسانی ارادوں کو عطا کی ہے صرف اسی صورت میں باعث برکت ثابت ہو گی نہ کہ زحمت جب وہ مقاصد جو ان ارادوں کا مقصود ہیں اسی حساب سے فروغ پذیر ہوں جس حساب سے ان کے حصول کی قوت بڑھتی ہے۔ سردست صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ ہر اتوار ہمیں یہ درس دیا جاتا ہے کہ اپنے ہمسائے سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ اس سے محبت کرو۔ تاہم ہفتے کے چھ دن ہمیں یہ درس دیا جاتا ہے کہ ہمسایوں سے نفرت کرو اب تک ہم نے ہمسائے سے جس حد تک بدسلوکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ ہماری نااہلی کی وجہ سے محدود تھا۔ لیکن اس دنیا میں جس میں ہم داخل ہو رہے ہیں اس قسم

کی کوئی حد بندی نہیں ہوگی اس نفرت کا سلوک صرف تباہی پر منتج ہوسکتا ہے۔

یہ سوچ بچار ہمیں احساس اور جذبے کے میدان تک لے آتا ہے۔ یہ جذبہ ہی ہے جو ان مقاصد کا تعین کرتا ہے جو ہمیں حاصل کرنے ہیں یہ فیصلہ جذبہ ہی کرے گا کہ انسانی قوت میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا بہترین مصرف کیا ہے۔ ہماری دوسری ذہنی صلاحیتوں کی طرح جذبہ بھی جہد للبقا کی کشمکش میں آہستہ آہستہ فروغ پاتا رہا ہے۔ ابتدائی دور ہی سے انسان گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ اور یہ گروہ آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ یہ خاندان سے قبیلہ' قبیلوں سے قوم اور قوموں سے وفاق کے درجے تک پہنچے ہیں۔ اس عمل کے دوران حیاتیاتی ضرورتوں نے اخلاق کے دو متضاد ضابطوں کو جنم دیا۔ ایک اپنے معاشرتی گروہ سے برتاؤ کا ضابطہ دوسرے غیروں سے پیش آنے کا طریقہ۔ احکام عشرہ ہمیں یہ درس دیتے ہیں کہ قتل اور چوری سے باز رہو۔ لیکن اپنے معاشرتی گروپ سے باہر یہ ہدایت کئی حدود کی پابند ہے تاریخ میں جن لوگوں کو بہت شہرت نصیب ہوئی ان میں سے اکثر کی شہرت کا مدار اس مہارت پر تھا جس کی بدولت انہوں نے اپنے گروہ کو دوسرے گروہوں کے افراد کو قتل کرنے اور ان کا مال چھیننے میں مدد دی تھی۔ انگلینڈ کے شرفاء کے خاندان آج بھی یہ ثابت کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں کہ ان آباء ہن نسل سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے سیکسن لوگوں کو قتل کرنے میں ان کے مقابلے میں زیادہ مہارت کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہماری جذباتی زندگی اس حد تک متاثر ہو چکی ہے کہ اب وہ حیاتیاتی اعتبار سے غیر مفید حدوں میں داخل ہوگئی بے سبب اس کا وہی تفاوت ہے جو اپنے گروہ اور اس اجنبی گروہ کے مابین روا رکھا جاتا جس کے خلاف اجتماعی طور پر ہم سرگرم عمل ہوں۔ نئی دنیا میں جو جدید تکنیک سے وجود میں آئے گی۔ اقتصادی خوش حالی اس قانون کے برعکس جس کی اب تک پیروی کی ہے ایک مختلف نہج پر استوار ہوگی۔ ایک وحشی قبیلہ اگر اپنے مخالف قبیلے کی بیخ کنی کرنے پر قادر ہوتو ان کے جان و مال پر اب پہلے کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے متصرف ہو سکتا ہے۔ فتح کے یہ فوائد مسلسل زوال پذیر ہونے کے باوصف ماضی قریب تک سرگرم کار رہے ہیں۔

لیکن اب حالات مختلف ہیں۔ وہ قومیں جو باہم تعاون کرتی ہیںا۔ (باہمی مسابقت

کے ذریعے فرداً فرداً خوشحالی حاصل کرنے کے مقابلے کے برعکس) ان کے لیے خوشحالی کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ مسابقت کا جذبہ صرف اس لیے باقی ہے کہ ہم نے ابھی نئی تکنیک سے ہم آہنگی پیدا نہیں کی۔ یعنی ہمارے جذبے ہماری مہارت کے ساتھ ساتھ فروغ پذیر نہیں ہوئے۔

مہارت میں ترقی، جذبات کی متوازی وسعت کے بغیر ایک ایسا تکنیکی آہنگ پیدا کرتی ہے جو مقاصد میں ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث کامیاب نہیں ہوسکتا۔ تکنیکی طور پر ترقی یافتہ دنیا میں ایک علاقہ میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے وہ ایک دوسرے علاقے میں بھی اہم اثرات مرتب کرتا ہے۔ جب تک ہم جذباتی سطح پر صرف اپنے علاقے کو پیش نظر رکھیں گے مجموعی حیثیت سے مشین صحیح کارکردگی نہیں دیکھا سکے گی۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مختلف صورتوں میں ارتقاء کے دوران موجود رہا ہے۔ سپنج سمندر میں اپنی زندہ حالت میں فلیٹوں کے ایک بلاک کی طرح ہوتا ہے۔ یعنی متعدد مختلف جانداروں کی ایک مشترکہ رہائش گاہ جو ایک دوسرے کے محتاج نہیں ہوتے۔ ان میں سے کسی کو بھی دوسروں کے معاملات سے سروکار نہیں ہوتا۔ ایک زیادہ ترقی یافتہ جانور کے جسم میں بھی ہر خلیہ کم و بیش ایک الگ جاندار کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک نشوونما نہیں پا سکتا جب تک پورے جسم میں نشوونما کا عمل جاری نہ ہو۔ کینسر کے مرض میں خلیوں کا ایک مجموعہ ایک طرح کے استعماری عمل میں مصروف ہو جاتا ہے لیکن باقی جسم کی تباہی کا سامان کرتے ہوئے وہ خود اپنے آپ کو فنا کر دیتا ہے۔ انسانی جسم اپنے انفرادی مقصد کے اعتبار سے ایک وحدت ہے۔ چنانچہ انگوٹھے کا مقصد چھوٹی انگلی سے مختلف نہیں ہوسکتا۔ جسم کے کسی ایک حصے کے پھلنے پھولنے کے لیے پورے جسم میں متحدہ مقاصد کے حصول کے لیے تعاون کا ہونا ضروری ہے۔

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزل صنعت کے رہ پیما ہیں، دست و پائے قوم (اقبال)

اگرچہ فی الحال یہ ناممکن ہے۔ تاہم اس قسم کا ایک اتحاد انسانی معاشرے میں بھی نمو پذیر ہو رہا ہے۔ جو آہستہ آہستہ ایک ایسے اتحاد کی طرف بڑھ رہا ہے جو ہمیں ایک انسانی جسم میں نظر آتا ہے۔ جب آپ کھانا کھاتے ہیں تو حالت صحت میں اس سے آپ کے جسم

کا ہر عضو فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس وقت آپ یہ نہیں سوچتے کہ آپ کا منہ کتنا مفید عمل سرانجام دے رہا ہے کہ وہ ساری زحمت اپنے لیے نہیں بلکہ دوسرے اعضاء جسم کے لیے برداشت کر رہا ہے۔ ذاتی نفع کے تصور میں اسی طرح کا ایک اتحاد اور توسیع واقع ہو رہی ہے جس کا واقع ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ سائنسی سماج کی بقا اسی سے مشروط ہے۔ جذبے کے میدان میں کشادگی دنیا کے مختلف حصوں میں باہمی انحصار کے نئے شعور کی وجہ سے لازمی ہو گئی ہے۔

مستقبل کی ایک ممکنہ مثال پر غور کیجئے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ کرہ ارض کے جنوبی نصف کا کوئی ملک منطقہ باردہ کو آباد کرنے کے لیے کارروائی کا آغاز کرتا ہے۔ پہلا مرحلہ اس مین برف کو پگھلانے کے لیے ہوگا۔ جو آئندہ سائنس کے امکانات میں شامل ہے۔ پگھلی ہوئی برف سطح سمندر کو ہر جگہ بلند کر دے گی۔ نتیجتاً ہالینڈ لاؤسی آنا بہت سے دوسرے ملک جن کی سطح کم بلند ہے غرقاب ہو جائیں گے۔ قدرتی طور پر یہ سب ملک ایسے منصوبے کی مخالفت کریں گے جو ان کی غرقابی کا نقیب ہو۔ میں نے عمداً ایک ایسی مثال پیش کی ہے جو بہت حد تک تخیلی اور بعید از عمل ہے۔ کیونکہ میں ان تمام باتوں سے گریز کرنا چاہتا ہوں جو موجودہ سیاسی جذبات کو ہوا دے سکتی ہیں۔ میرا مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ مکمل باہمی انحصار کے لیے مقصد کی یکجہتی لازمی ہے۔ تباہی سے بچنے کی یہی ایک صورت ہے۔ یہ متحدہ مقصد اس وقت تک برسر کار نہیں آ سکتا۔ جب تک جذبات میں ہم آہنگی نہ ہو۔ آپ کو ان بلیوں کا حشر تو یاد ہے جن میں باہم لڑتے لڑتے صرف دموں کے نشان باقی رہ گئے تھے۔ اگر انہوں نے تھوڑی سی نرم دلی سے کام لیا ہوتا تو دونوں خوش باش زندگی بسر کرتیں۔

ایک تھا تیتر ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر
لڑتے لڑتے ہو گئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دم (تبسم)

مذہب نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے ہمسائے سے محبت کرو اور دوسروں کی بھلائی کے لیے دعا کرو۔ بدقسمتی سے عملی دنیا میں اس پر بہت کم عمل ہوا ہے۔ لیکن جہان نو میں دوسروں کے لئے مہر و محبت جس کی مذہب تلقین کرتا ہے صرف ایک اخلاقی فریضہ ہی نہیں ہو

گا بلکہ زندہ رہنے کے لیے ایک ناگزیر ضرورت۔ ایک انسانی جسم زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر ہاتھ پاؤں سے اور پیٹ جگر سے برسرِ پیکار ہو۔ انسان بھی اس اعتبار سے اب انسانی جسم سے زیادہ سے زیادہ مشابہت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اپنی بقاء کے لیے ہمیں اس قسم جذبات کی پرورش کرنا ہوگی جو ایک فرد کے پورے جسم کی نشوونما سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ صرف ایک عضو کے لیے۔ یہ جذبات بہرحال پسندیدہ ہیں۔ لیکن اب پہلی دفعہ انسانی تاریخ میں انہیں ضرورتاً تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اس کے بغیر فرد واحد نہ کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ نہ کسی خیر سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔

پیغمبر اور شاعر دیر سے اس قسم کی توسیع کی پیشین گوئی کرتے چلے آئے ہیں جس کی میں وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ انہوں نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ایک چیز جسے دانش کہا جاتا ہے وہ ازل سے انسانی دسترس میں ہے۔ یہ نہ صرف علم ہے نہ صرف عمل نہ صرف جذبہ بلکہ ان کا مرکب ہے جس میں تینوں شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔

نومولود بچے کی دنیا اس کے قریب ترین ماحول تک محدود ہوتی ہے۔ یہ مختصر سی دنیا ان چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کا حواس فوراً ادراک کر لیتے ہیں۔ اس کی حدود یہاں اور اب سے آگے نہیں بڑھتیں۔ جوں جوں علم ترقی کرتا ہے یہ حدیں بھی پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ حافظہ اور تجربہ بتدریج بچے میں ان چیزوں کا واضح شعور پیدا کرتے ہیں جو کبھی ماضی کا حصہ تھیں یا دور دراز علاقوں سے تعلق رکھتی تھیں اگر یہ بچہ بڑا ہو کر سائنس دان بنتا ہے۔ تو زمان و مکاں کی بعید ترین وسعتیں اس کی دسترس میں ہوں گی۔ جن کا میں ابتداء میں ذکر کر چکا ہوں۔ دانشمندی کے لیے ضروری ہے کہ علم کی نسبت سے اس کے جذبات بھی وسعت پذیر ہوں۔ ماہرین الٰہیات ہمیں بتاتے ہیں کہ خدا کے لیے پوری کائنات ایک وسیع کل کی طرح ہے جس میں نزد و دور اور دیر و زود نہیں ہوتے۔ اس کے ہاں احساس و شعور کی وہ حد بندیاں نہیں پائی جاتی ہیں جن کے ہم کم و بیش پابند ہیں۔ ہم اس مطلق شعور کو تو نہیں پہنچ سکتے۔ یہ نارسائی دراصل ہماری زندگی کے لیے ضروری ہے۔ تاہم جہاں تک ہو سکے اپنی انسانی حدود کے اندر رہ کر اس کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔

ہماری روزمرہ زندگی کا اثاثہ پریشانیاں اور محرومیاں ہیں۔ ہم بہت جلد ان رکاوٹوں کے خیالات میں کھو جاتے ہیں جو ہمارے قریبی ماحول میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تاہم اس امر کا

بداہتہً امکان موجود ہے اور دانشوروں نے اس کی تصدیق بھی کر دی ہے کہ ہم اس وسیع تر دنیا میں زندگی بسر کریں جو ہمارے عمیق جذبات کونمو بخشتی ہے۔ اور کائناتی مسائل کی شدت کا بھی اندازہ کریں۔ یہ چیز کچھ لوگوں کو وافر مقدار میں مہیا ہوتی ہے اور بعض کو قلیل تر مقدار میں۔ لیکن جو بھی اس جہت میں سعی کرتے ہیں کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتے ہیں اور اپنی کامیابی کی حد تک وہ ایک طرح کے سکون اور طمانیت سے بہرہ مند ہو جاتے ہیں۔ جو ان کے اعمال میں رکاوٹ تو نہیں بنتی لیکن ان کی شوریدگی کو کم کر دیتی ہی۔

ذہن کی جس کیفیت کو بیان کرنے کی میں کوشش کر رہا ہوں یہی میرے نزدیک دانشمندی کی تعریف ہے اور یہ بلاشک و شبہ لعل و جواہر سے زیادہ قیمتی ہے۔ آج دنیا کو دانشمندی کی جتنی ضرورت ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ اگر انسانیت نے اسے پا لیا تو فطرت پر ہمیں جو قوت حاصل ہو رہی ہے وہ مسرت اور فلاح و بہبود کے ایسے دروا کر سکتی ہے جس کا انسان کو پہلے تجربہ نہیں ہوا۔ بلکہ جہاں تک اس کی تخیل کی رسائی میں بھی ممکن نہیں تھا۔ اگر انسانیت یہ مقام حاصل نہیں کر سکتی تو اس کی مہارت اسے ناقابل تلافی بربادی سے دوچار کر دے گی۔ انسان نے کچھ اچھے کام بھی کئے ہیں اور کچھ برے بھی۔ کچھ اچھے کام بہت ہی نفع بخش تھے اور سب قوتوں کو جو ان اچھے کاموں کے قدرداں ہیں پورے وثوق کے ساتھ یہ امید رکھنی چاہیے کہ اس فیصلہ کن مرحلے پر ہمارا انتخاب بلاشبہ دانشمندانہ ہوگا۔

☆☆☆